مشعل ہدایت

تالیف

جناب سیادت مآب الحاج آغا سید حسین

سابق سینیٹر و ممبر مجلس شوری کوئٹہ

تصحیح

مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم

اہتمام

جرگہ اتحاد سادات کوئٹہ

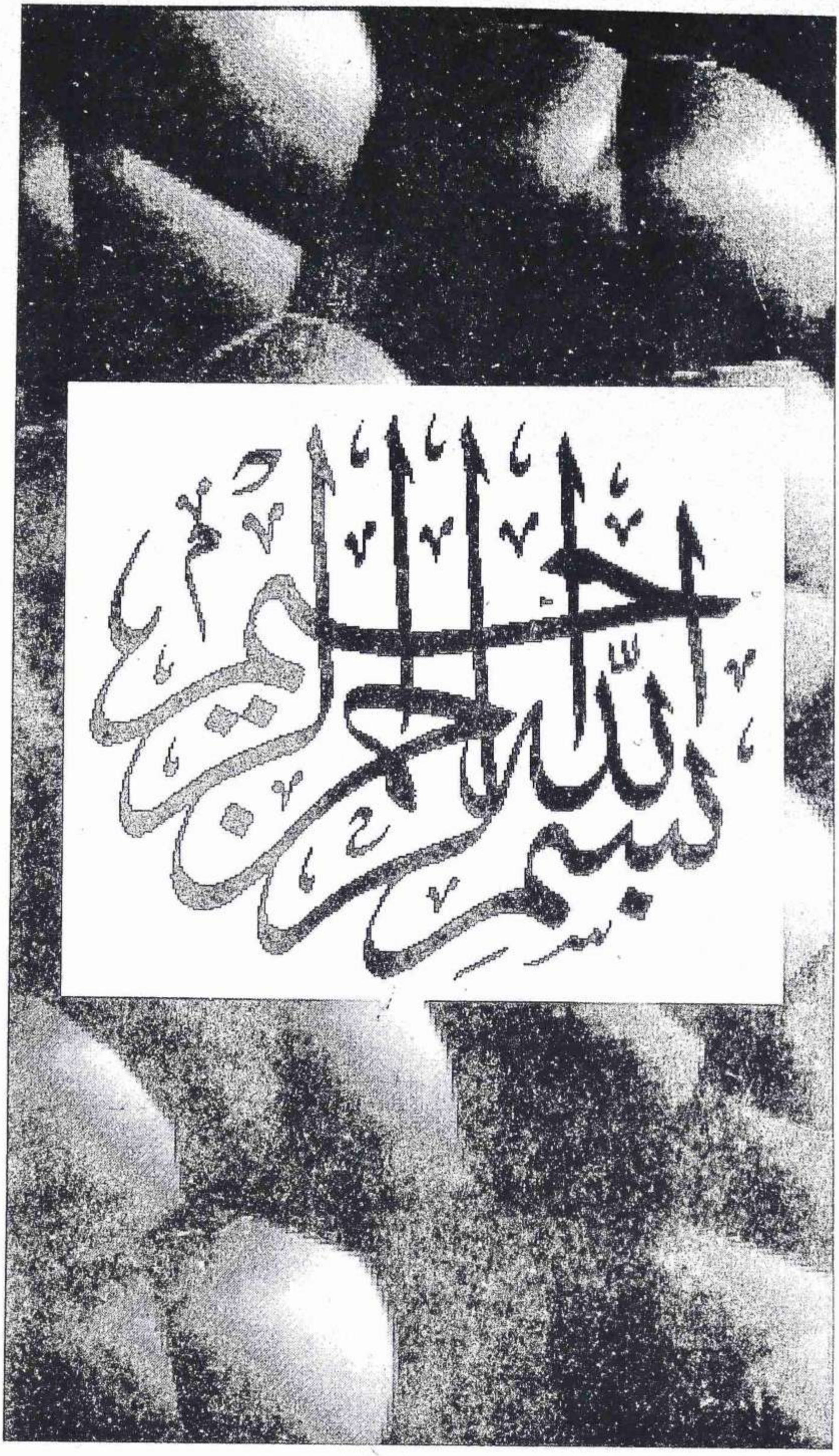

مشعل ہدایت

تالیف

جناب سیادت مآب الحاج آغا سید حسین

سابق سینیٹر و ممبر مجلس شوری کوئٹہ

تصحیح

مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم

اہتمام

جرگہ اتحاد سادات کوئٹہ

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

نام کتاب	.....	مشعل ہدایت
تالیف	.....	الحاج آغا سید حسین شاہ
تصحیح	.....	مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم
تاریخ اشاعت	.....	دسمبر ۱۹۹۹ء
بار	.....	دوئم
تعداد	.....	۱۰۰۰
کمپوزنگ	.....	عدیل عابد علی، ادارہ منہاج الصالحین لاہور
ہدیہ	.....	۱۰۰ روپے
اہتمام	.....	جرگہ اتحاد سادات کوئٹہ

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین، جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور

فہرست

پیش لفظ	.....	1
مذہب حقہ کا اصول و قروع	.....	3
تقلید و اجتہاد	.....	5
اہل تشیع کے نزدیک تقلید کے دو دور	.....	15
مسئلہ تقیہ	.....	23
مسئلہ بداء	.....	32
توحید الشیعہ	.....	37
شان رسالت عند الشیعہ	.....	39
معینہ مدت کا نکاح	.....	41
نماز کے بارے میں اختلاف کا اجمالی نقشہ	.....	58
حی علی خیر العمل	.....	69
پاؤں کا مسح	.....	84
ابن سباء کا مفروضہ	.....	98
مسئلہ جمع بین الصلاتین	.....	107
خاک کربلا پر سجدہ	.....	114
صحابہ کے بارے میں شیعہ سنی نظریہ	.....	123
لمحہ فکریہ	.....	157
اصحاب صلح حدیبیہ میں	.....	164
اصحاب اور واقعہ قرطاس و قلم	.....	171
اصحاب اور لشکر اسامہ	.....	184

پیش لفظ

انجمن سپاہ صحابہ نامی تنظیم اپنے نام سے یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مقصد صحابہ کرارم کا دفاع کرنا ہے، لیکن در حقیقت اس تنظیم کے مقاصد اس کے بر عکس ہیں۔ انجمن سپاہ صحابہ پاکستان میں فرقہ واریت پھیلا کر تشدد اور دہشت کی فضا قائم کرنا چاہتی ہے، تاکہ اس ملک میں امن وامان اور سلامتی کی صورتحال کبھی مستحکم نہ ہو، اور انجمن اس طرح قدیم اور جدید استعمار و سامراج کے تسلط کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے۔ حالانکہ آج تمام دنیا میں تمام استحالی ظالمانہ اور استعماری نظام اور قوتیں دم توڑ رہی ہیں لیکن انجمن سپاہ صحابہ پاکستان اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہے۔

عوام و خواص مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے ضروری ہے کہ اس

انجمن کے چہرے سے دفاع صحابہ کا نقاب الٹ دیا جائے تاکہ اس کا حقیقی اور مکروہ چہرہ برادران اسلام کے سامنے آجائے اور وہ اس کے زہریلے پروپیگنڈے' بہتان تراشیوں اور غلط پر فریب نعروں کے جال میں نہ آئیں۔

اس مطلب کے اثبات اور وضاحت کے لیے قارئین کی خدمت میں مختصر طور پر انجمن سپاہ صحابہ کے سربراہ ضیاء الرحمٰن فاورقی کا حالیہ دوہ بلوچستان کے جلسوں اور جلوسوں میں تقسیم ہونے والے اشتہار کا منطقی و استدلالی جواب پیش کیا جا رہا ہے۔

ہمارا مقصد جھوٹے پروپیگنڈے سے گمراہ ہو چکنے والے لوگوں کی ہدایت کا سامان اور استعماری سازشوں کا سدباب ہے' تاکہ احقاق حق اور ابطال باطل ہو جائے۔ امید ہے کہ ہماری یہ کاوش مسلمانوں کے درمیان محبت و اخوت کی فضا کو سازگار کرنے میں ممدو معاون ثابت ہوگی۔ خداوند متعال ہمیں زیادہ سے زیادہ کارخیر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اس گروہ کی طرف سے پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی ہمت و طاقت عطاء فرمائے' آمین بحق محمدؐ و آل محمدؐ۔

الاحقر

سید حسین

مذہب حقہ کے اصول و فروع

یہ سراسر بہتان ہے کہ ایرانیوں نے نعوذ باللہ حضرت آیت اللہ العظمی امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ کو کلمہ میں شامل کیا ہے۔ شیعہ لفظ آیت اللہ ہر مجتہد جامع شرائط کے نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور لفظ حجت اللہ صرف اپنے بارہ معصوم اماموں ؑ کے نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ برا ہو اندھے تعصب اور عناد کا جو حقائق کو چھپانے اور الٹا کر کے لفظ آیت اللہ کو لفظ حجت اللہ لکھ کر پیش کرتا ہے۔ متعصّب اپنے مخالف پر اعتراض کرنے کے لیے صاف اور واضح امور کا انکار کر گزرتا ہے' بات بے بات مخالف پر اعتراض کرتا ہے اور ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتا ہے' جبکہ خود بہت زیادہ قابل اعتراض باتیں کہتا ہے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے نائبین آئمہ معصومین علیہم السلام کی تعداد بارہ ہے۔ یہ تعداد نہ کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آئمہ ؑ کی تعداد کے ساتھ ان کے نام بھی بتائے ہیں۔ ان کے

اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

1 حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام

2 حضرت امام حسن مجتبیٰ ابن علی علیہ السلام

3 حضرت امام حسین ابن علی علیہ السلام

4 حضرت امام زین العابدین علی ابن حسین علیہ السلام

5 حضرت امام محمد باقر ابن علی علیہ السلام

6 حضرت امام جعفر الصادق ابن محمد علیہ السلام

7 حضرت امام موسیٰ کاظم ابن جعفر علیہ السلام

8 حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام

9 حضرت امام محمد تقی بن علی علیہ السلام

10 حضرت امام علی نقی بن محمد علیہ السلام

11 حضرت امام حسن عسکری بن علی علیہ السلام

12 حضرت حجتہ بن الحسن صاحب الزمان علیہ السلام

(بحوالہ ینابیع المودۃ، مصنف سلیمان قندوزی حنفی)

یہ ہیں آئمہ اثنا عشر! جن کی عصمت و طہارت کے شیعہ قائل ہیں۔ انجمن سپاہ صحابہ کے افترا پرداز ضیاء الرحمٰن فاروقی یہ کہہ کر کچھ مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ شیعہ اہل بیتؑ کی عصمت کے قائل ہیں اور

آیت اللہ خمینی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی معصوم کہہ کہ اہل بیتؑ میں شامل کرتے ہیں۔ فاروقی صاحب اور ان کی سپاہ صحابہ چونکہ غیر مقلد ہیں' اس لیے یہ لوگ تقلید اور اجتہاد کے الفاظ سے بالکل نابلد ہیں چنانچہ وہ شیعوں پر بے جا اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

تقلید و اجتہاد

شیعیان حیدر کرار کا عقیدہ ہے کہ فروع دین شریعت کے وہ احکام ہیں جن کا تعلق عبادات و اعمال سے ہے مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ ان پر عمل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تین صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا واجب ہے=

(1) یا تو آدمی خود اجتہاد کرے اور اسلامی احکام کے استنباط و استخراج کے دلائل پر غور کرے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اتنا علم رکھتا ہو کہ وہ احکام الہیہ کا استدلال و استخراج کر سکے۔

(2) یا احتیاط پر عمل کرے' بشرطیکہ خود اتنا بڑا عالم ہو کہ وہ احکام شرعیہ کا استنباط کر سکے۔

(3) یا پھر کسی جامع الشرائط مجتہد کی تقلید کرے۔

جس مجتہد کی تقلید کی جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ' عاقل' عادل' پرہیزگار اور دین پر عامل ہو۔ باتقویٰ اور متقی ہو۔ اپنی

خواہشات نفسانی پر نہ چلتا ہو' بلکہ احکامات الٰہی کی پیروی کرتا ہو۔

فروعی احکام میں اجتہاد تمام مسلمانوں پر واجب کفائی ہے۔ اگر کوئی ایک مسلمان بھی جس میں اس کام کی علمی لیاقت اور استعداد ہے----- اس کام کو سرانجام دے تو باقی مسلمانوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔

اجتہاد کی اصلاح شیعوں کے ہاں بھی موجود ہے' لیکن اس کے وہ معنی نہیں جو سینوں نے عملی طور پر اسے دے دیئے ہیں۔ اہل سنت کے ہاں عملاً اجتہاد میں "ذاتی رائے کے اظہار" کا عنصر بھی موجود ہے' جبکہ شیعوں میں اجتہاد فقط احکام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے اور مجتہد کسی طور پر بھی اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کرتا۔ البتہ اصطلاح کی تعریف کرتے وقت دونوں مکاتب فکر کی اصولی کتب میں ایک ہی جملہ استعمال ہوتا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے سینوں میں فقیہ یا (غیر معصوم) صحابہ کی رائے کا احکام میں دخل ہے جبکہ شیعوں کا مکتب صرف خدا و رسولؐ کے احکامات و ارشادات معتبر گردانتا ہے۔ مثلاً امام محمد باقر یا امام جعفر صادقؑ یہ نہیں فرماتے تھے کہ انا اقول (میں کہتا ہوں) یا انا احرم (میں حرام کرتا ہوں) بلکہ یہی فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا ہے یا خدا نے یوں فرمایا ہے۔ یہ مکتب اہل بیتؑ کا امتیاز ہے۔

شیعہ ان علماء کا اجتہاد قبول کرتے ہیں جو سب سے اعلم و متقی ہو

جس نے اپنی زندگی اجتہاد کا یہ عظیم رتبہ حاصل کرنے میں صرف کی ہو۔ مسلمانوں کے لیے ایسے مجتہد کی تقلید کرنا اور فروع دین میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔ لیکن اجتہاد کا رتبہ حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں' اور نہ اس کا حصول سب کے لیے ممکن ہے' اس کے لیے سخت محنت' بہت وقت اور بہت وسیع علمی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے' اور یہ سعادت صرف انہیں ہی میسر آتی ہے جو سخت محنت اور کوشش کرتے اور اپنی تمام عمر تحقیق و تعلیم میں کھپاتے ہیں۔ ان میں بھی اجتہاد کا رتبہ صرف خاص خاص خوش نصیبوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے=

(مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهُهُ فِى الدِّيْنِ)

اللہ جس کے ساتھ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سوجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے"

اس سلسلے میں شیعوں کا یہ قول اہل سنت کے ایسے ہی قول سے مختلف نہیں۔۔۔۔ صرف اس بارے میں اختلاف ہے۔۔۔۔۔ کہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق مجتہد کا زندہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن شیعوں اور سینوں میں واضح اختلاف اس امر میں بھی پایا جاتا ہے کہ تقلید پر کیسے عمل کیا جائے؟ شیعوں کا اعتقاد ہے کہ وہ مجتہد جس میں مندرجہ بالا تمام شرائط پائی

جاتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ صاحب الامر امام علیہ السلام کانائب ہے۔ اور غیبت امامؑ کے زمانے میں وہ حاکم اور سربراہ ہے۔ اور مقدمات کا فیصلہ کرنے' اور لوگوں پر حکومت کرنے کے مجتہد کو وہی اختیارات حاصل ہیں۔۔۔۔۔۔ جو امام علیہ السلام کو حاصل ہیں بلکہ جس نے مجتہد کا انکار کیا گویا اس نے امام کا انکار کیا۔

اہل تشیع کے نزدیک جامع الشرائط مجتہد کی طرف صرف فتوے کے لیے ہی رجوع نہیں کیا جاتا' بلکہ اسے اپنے مقلدین پر ولایت عامہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے مقلدین اپنے مقدمات کے تصفیہ کے لیے بھی اپنے مجتہد سے رجوع کرتے ہیں اور اپنے اموال کا خمس اور زکوٰۃ بھی مرجع تقلید ہی کو ادا کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ جو خمس اور زکوۃ میں امامؑ زمانہ کے نائب کی حیثیت سے شریعت کے مطابق تصرف کرتا ہے۔

لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک مجتہد کا یہ مرتبہ نہیں۔ اہل سنت امامؑ کو نائب رسولؐ تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ وہ فقہی مسائل میں صاحب مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

برادران اہل سنت کے آئمہ اربعہ کے نام یہ ہیں=

(۱) ابو حنیفہ نعمان بن ثابت بن روطی (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ)

(۲) مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر اصبحی (۹۳ھ تا ۱۹۸ھ)

(۳) محمد بن ادریس بن عباس عثمان بن شافع (۱۵۰ھ تا ۱۹۸ھ)

(۴) احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ)

موجودہ دور کے بعض اہل سنت حضرات ان میں سے کسی ایک معین امام کی تقلید نہیں کرتے' بلکہ اپنی مصلحت کے مطابق بعض مسائل میں کسی ایک امام کی تقلید کرتے ہیں اور کچھ دوسرے مسائل میں کسی دوسرے امام کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ سید سابق نے چاروں اماموں کی فقہ سے ماخوذ ایک کتاب مرتب کی ہے۔ کیونکہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اصحاب مذاہب کا اختلاف رحمت ہے' اس لیے اگر کسی مالکی کو اپنی مشکل یا مسائل شرعیہ کا حل اپنے امام کے ہاں نہ ملے' اور امام حنیفہ کے ہاں مل جائے تو وہ امام ابو حنیفہ کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ مذاہب اربعہ کے درمیان اجتہادی اختلافات تو بہت زیادہ ہیں اختصار کو مد نظر رکھ کر ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امام مالک کی رائے ہے کہ کنواری باکرہ لڑکی کا نکاح سرپرست کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ بلکہ اگر مطلقہ یا بیوہ ہو تب بھی ولی کی اجازت ضروری ہے۔

ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ بالغہ چاہے باکرہ ہو یا مطلقہ ہو یا بیوہ ہو اسے خود اپنا شوہر پسند کرنے اور عقد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

اہل سنت کے نزدیک جس امام کی تقلید کی جائے اس امام کو وہ درجہ رفیعہ حاصل نہیں ہو جاتا۔۔۔۔۔ جس کے شیعہ قائل ہیں یعنی نیابت رسول ؐ کا درجہ۔ اس کی وجہ شوریٰ ' خلیفہ یا امام کے انتخاب کا نظریہ ہے۔ اہل سنت نے خود اپنے آپ کو یہ حق دے دیا ہے کہ وہ جس کو چاہیں خلیفہ یا بہتر الفاظ میں امام بنا دیں۔ اسی طرح ان کے خیال میں انہیں یہ بھی حق ہے کہ وہ چاہیں تو امام کو معزول کر دیں' یا اس کے بجائے اپنی دانست میں جسے بہتر سمجھیں۔۔۔۔۔۔ اسے مقرر کر دیں۔ یہ صورت شیعہ عقیدہ کے بالکل بر عکس ہے۔

اگر اہل سنت کے پہلے امام یعنی حضرت ابو بکر صدیق پر نظر ڈالیں کہ انہوں نے امت سے اپنے پہلے خطاب میں کہا تھا=

"ایھا الناس لقد ولیت علیکم ولست بخیر کم فان اطعت فاعینونی و ان عصیت فقومونی"

"اے لوگو! مجھے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے اگرچہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ چنانچہ جب تک میں صحیح راستے پر چلوں تو میرے ساتھ تعاون کرتے رہنا اور جب میں بھٹک جاؤں تو مجھے صحیح راہ پر چلا دینا۔"

اہل سنت کے معروف علماء کی کتابیں ملاحظہ کریں=

(۱) ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۸

(۲) ابن قتیبہ ۔ کتاب الامامت والسیاست صفحہ ۱۶

(۳) جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفاء مطبع مجتبائی صفحہ ۵۱

(۴) حسن علی محدث تفریح الاحباب، مترجم حامل المتن صفحہ ۴۰ ۔ ۵۶ ۔

۵۷ ۔ ۶۱

(۵) محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم والملوک جلد ۳ صفحہ ۲۰۳ ۔ ۲۱۱

(۶) تاریخ الکامل جلد ۲ صفحہ ۱۲۹

(۷) علی المتقی، کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۳۰ حدیث ۲۲۶۲ ۔ ص ۱۳۶ ۷

حدیث ۲۳۰۷

اسی طرح خلیفہ اول خود اعتراف کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان کو پسند کیا ہے اور ان کی بیعت کی ہے انہیں یہ بھی حق ہے کہ معصیت اور خطاء کی صورت میں وہ ان کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

اس کے برعکس جب ہم اہل تشیع کے پہلے امام علی بن ابی طالب علیہ السلام کی افکار پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی امامت و ولایت کے قائل ہیں۔۔۔۔۔۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ان کو امامؑ برحق مان کر دراصل حکم خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت علیؑ کو ایسی ولایت مطلقہ حاصل ہے۔۔۔۔۔۔ جیسی اللہ اور اس کے رسولؐ کو حاصل ہے امام علیہ السلام کو خود اللہ منتخب کرتا ہے اسی طرح

امت کے لیے بھی یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ امام علیہ السلام کے کسی حکم کی مخالفت کرے' یا اس کا مقابلہ کرے' کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے=

(وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی الله و رسوله امرا ان یکون لهم الخیره من امرهم و من یعص الله و رسوله فقد ضل ضلالا مبینا ○)

"چونکہ حضرت علی ؑ کو اللہ اور اس کے رسول ؐ نے مسلمانوں کا امام ؑ مقرر کیا تھا۔۔۔۔۔۔ اس لیے ان کی حکم عدولی نہیں کی جاسکتی' اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی معصیت کا ارتکاب کریں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

علی مع الحق والحق مع علی ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض ○

"علی ؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علی ؑ کے ساتھ ہے دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔۔۔۔۔۔ جب تک میرے پاس حوض پر نہ آجائیں۔"

حوالہ جات ملاحظہ کریں=

(۱) محمد بن عیسیٰ ترمذی' جامع ترمذی جلد ۵ صفحہ ۲۹۷

(۲) علاء الدین متقی ہندی' کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۳۰

(۳) محمد عبداللہ حاکم نیشاپوری' مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۲۴

(۴) جار اللہ زمخشری ربیع الابرار حجر ھیشمی مکی' صواعق محرقہ صفحہ ۱۲۲

(۵) ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۵۷۲

(۶) حافظ ابو بکر خطیب بغدادی' تاریخ بغداد جلد ۱۴ صفحہ ۳۲۱

(۷) حافظ ابن عساکر' تاریخ دمشق جلد ۳ صفحہ ۱۱۹

(۸) ابن قتیبہ دینوری' الامامتہ والسیاسہ جلد ا صفحہ ۳۷

تقلید کے مسئلہ میں فریقین کا استدلال (ان کے دو مختلف نظریوں کی بنیاد پر) آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی سنی شوریٰ کے نظریہ کے قائل ہیں' اور شیعہ نص کے تابع ہیں۔

اس کے بعد تقلید کے متعلق شیعہ اور سنی میں ایک اور معرکتہ الاراء اختلاف باقی رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ تقلید میت کا مسئلہ ہے۔

اہل سنت جن آئمہ کی تقلید کرتے ہیں' انہیں فوت ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ یعنی آئمہ اربعہ کے بعد سے لے کر آج تک اہل سنت کے ہاں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ ان آئمہ اربعہ کے بعد جو علماء اعلام آئے ان کی ساری توجہ صرف اگلی کتابوں کی شرحیں لکھنے اور مذاہب اربعہ کے مطابق فقہی مسائل کے نظم اور نثر میں مجموعے مرتب کرنے پر مرکوز رہی۔ اب چونکہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کا آئمہ اربعہ کے زمانے میں

وجود بھی نہیں تھا' اس لیے بعض معاصرین آواز اٹھا رہے ہیں کہ زمانے کی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ پھر سے کھول دیا جائے۔

اس کے بر عکس شیعہ "مردہ" مجتہد کی تقلید جائز نہیں سمجھتے' اور وہ اپنے تمام مذہبی احکام و مسائل کے بارے میں زندہ مجتہد کی طرف رجوع کرتے ہیں' بلکہ یہاں تک کہ مردہ مجتہد کے فتویٰ پر عمل کرنے کے لیے بھی زندہ مجتہد کی تقلید کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور زندہ مجتہد بھی وہ جس میں وہ سب شرائط پائی جاتی ہوں۔۔۔۔۔ جن کا گزشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہ صورت امام زمانہؑ کی غیبت کے زمانے میں ہے۔ جب تک امام معصومؑ دوبارہ ظاہر نہیں ہوتے۔۔۔۔ شیعہ قابل اعتماد علماء اعلام ہی سے رجوع کرتے رہیں گے۔ آج بھی ایک سنی مالکی یہ کہتا ہے کہ امام مالک کے قول کے مطابق یہ فعل حرام ہے اور یہ حلال ہے۔ حالانکہ امام مالک کو فوت ہوئے کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہی صورت امام ابو حنیفہ' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے پیروکاروں کی ہے۔ کیونکہ یہ سب مذاہب اور آئمہ ایک ہی زمانے میں تھے اور ان سب کا ایک دوسرے سے استاد اور شاگرد کا تعلق تھا۔

اہل سنت اپنے آئمہ کے معصوم ہونے کے بھی قائل نہیں۔ نہ خود ان آئمہ نے کبھی عصمت کا دعویٰ کیا۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ آئمہ جو

اجتہاد کرتے ہیں اس میں خطاء اور صواب دونوں کا احتمال ہے۔ صواب کی صورت میں انہیں دو اجر ملتے ہیں اور خطا کی صورت میں ایک اجر۔ بہرحال اجر ہر اجتہاد پر ملتا ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک تقلید کے دو دور

پہلا دور آئمہ اثنا عشر کا دور ہے۔ یہ مرحلہ تقریباً ساڑھے تین سو سال پر محیط ہے۔ اس دور میں ہر شیعہ امام معصوم علیہ السلام کی تقلید کرتا ہے اور ان کا ہر حکم اپنے لیے واجب سمجھتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ امام معصوم علیہ السلام کوئی بات بھی اپنی رائے یا اپنے اجتہاد سے بیان نہیں کرتے تھے۔ امام علیہ السلام جو کچھ فرماتے تھے اپنے علم و فضل اور ان روایات کی بنیاد پر کہتے تھے جو اباً عن جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہنچی تھیں۔ مثلاً امام معصوم علیہ السلام کسی سوال کے جواب میں اس طرح کہتے تھے=

"روایت بیان کی میرے والد نے' انہوں نے یہ روایت سنی اپنے نانا سے' انہوں نے جبرائیل سے' اور انہوں نے اللہ عزوجل سے۔"

ہشام بن سالم اور حماد بن عیسیٰ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے' اور میرے والد کی

حدیث میرے دادا کی حدیث ہے' اور میرے دادا کی حدیث حسین علیہ السلام کی حدیث ہے' اور حسین علیہ السلام کی حدیث حسن علیہ السلام کی حدیث ہے' اور حسن علیہ السلام کی حدیث امیرالمومنین علی علیہ السلام کی حدیث ہے' اور امیرالمومنین علی علیہ السلام کی حدیث رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے' اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث ارشاد الٰہی ہے۔" (اصول کافی جلد ا صفحہ ۳۵)

عنبسہ روایت کرتے ہیں کہ=

ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کوئی مسئلہ پوچھا۔۔۔۔ تو آپؑ نے جواب دیا۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ اگر ایسا اور ایسا ہوتا تو اس میں دوسرا قول نہ ہوتا۔ امام عالی مقام نے فرمایا:

"جب کبھی ہم کسی مسئلے کا جواب دیتے ہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوتا ہے اور ہم کوئی جواب اپنی رائے سے نہیں دیتے۔" (بصائر الدرجات صفحہ ۳۰۰ تا ۳۱۰)

دوسرا دور زمانہ غیبت امام علیہ السلام کا ہے جو ابھی تک چل رہا ہے اگر آج کوئی شیعہ یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز آیت اللہ حافظ بشیر مدظلہ العالی کی رائے کے مطابق یا آیت اللہ سید محمد شیرازی کی رائے کے مطابق حلال یا حرام ہے۔۔۔۔ یہ دونوں مجتہد بحمد اللہ زندہ ہیں' ان کی رائے سے مراد یہ

ہے کہ قرآن ' سنت' حدیث نبوی آئمہ اہل بیت علیہ السلام کی روایات کے مطابق' اجتماع اور عقل کے مطابق احکام الٰہی کا استنباط اور استخراج کرنا۔۔۔۔۔ اسی چیز کا نام اجتہاد ہے۔

آئمہ اہل بیت علیہ السلام کی روایت کے بعد دوسرے درجے میں صحابہ عدول یعنی معتبر صحابہ کی روایات ہیں۔ آئمہ اہل بیت علیہ السلام کو ترجیح اس لیے ہے کہ وہ شریعت کے بارے میں اپنی رائے سے قطعی احتراز کرتے ہیں اور اس کے قائل نہیں کہ :

(ما من شی ء الا و اللہ فیہ حکم ○)

"یعنی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں اللہ کا حکم نہ ہو۔"

اگر کسی مسئلہ کے بارے میں ہمیں یہ حکم دستیاب نہ ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو نظرانداز کر دیا ہے۔ بلکہ یہ ہمارا قصور علمی اور ناواقفیت ہے' جس کی وجہ سے ہمیں اس کا علم نہیں ہوسکا۔ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں۔ اللہ سبحانہ کا قول ہے=

(ما فرطنا فی الکتاب من شئی ○)

"اس کتاب میں ہم نے کوئی چیز نظرانداز نہیں کی۔" (سورہ انعام آیت ۳۸)

مسئلہ اجتہاد و تقلید میں شیعوں کے کچھ ایسے عقائد ہیں جن پر ضیاء الرحمٰن فاروقی اور اس کے غیر مقلد پیروکار سپاہ صحابہ محض اس تعصب کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں------ کہ جو ان کے اسلاف امویوں اور عباسیوں نے اس لیے پھیلایا تھا کیونکہ وہ حضرت علی علیہ السلام سے بغض اور کینہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ امویوں نے علی الاعلان اسی (۸۰) برس تک منبروں سے جمعہ کے خطبوں میں جانشین رسول حضرت علی، علیہ السلام پر علانیہ محراب و منبر سے سب کروایا۔ (بحوالہ تاریخ عاشورا جامعہ تعلیمات اسلامی کراچی)

اس لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ یہ لوگ آج حضرت آیت اللہ خمینی کو گالیاں دیتے ہیں اور ان پر ہر طرح کے بہتان باندھتے ہیں۔ آیت اللہ خمینی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ اپنایا۔ ایران میں ظالم اور مستحکم طاغوت کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا' لیکن انہوں نے استقامت' دین کامل پر مکمل یقین اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے انتہائی صبر آزما جدوجہد کے بعد مملکت ایران (جو ہزاروں سالوں سے شہنشاہیت کے خونی پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی) کو اسلام کا دامن تھما دیا۔ فاروقی صاحب کو جب اور کچھ ہاتھ نہیں آیا تو پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ آیت اللہ خمینی رحمتہ اللہ علیہ کو ایرانیوں نے کلمہ میں شامل کرلیا ہے۔

یہ ہے مسخرا پن' افترا اور سفید جھوٹ ۔ شیعہ علماء کرام اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تو درکنار ایسی بات تو شیعہ عوام بھی نہیں کہتے۔ ان افتراء پردازوں کی جب اور کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوئی تو وہ سوچتے ہیں کہ شاید اس طرح وہ لوگوں کو (خصوصاً نوجوانوں کو جو اس قسم کے پروپیگنڈے پر آسانی سے یقین کرلیتے ہیں) شیعوں سے متنفر کرسکیں۔ شیعہ پہلے بھی اور آج بھی فقط ان آئمہ علیہم السلام کی عصمت کے قائل ہیں جن کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت بتلا دیئے تھے جب وہ (یعنی بارہ امام) پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

مسلمان بھائیو! دیکھئے تعصب کیسے آنکھوں کو اندھا کر دیتا ہے' اور دلوں پر غلاف چڑھا دیتا ہے؟ پھر حق سجھائی نہیں دیتا۔ عصمت انبیاء کے بارے میں شیعہ عقیدہ ہی وہ محکم اور مضبوط عقیدہ ہے جس سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور تمام نفسانی و شیطانی وسوسوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اور مفسدوں خصوصاً یہودیوں' عیسائیوں اور دشمنان اسلام کا راستہ بند ہو جاتا ہے' حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ ضیاء الرحمٰن فاروقی اپنے اشتہار (منجانب حزب مصطفیٰ) میں قرآنی آیت الیوم اکملت لکم دینکم کا حوالہ دے کر آیت اللہ خمینی رحمتہ اللہ علیہ پر بہتان لگایا ہے کہ انہوں نے حضرت رسول مقبول ؐ کی ناکامی کا برملا اعلان کر دیا۔

اس اشتہار میں "اکملت لکم دینکم" سے پہلے جو معنی خیز جملہ ارشاد ہوا ہے اس کو نظر انداز کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے۔ "الیوم بئس الذین کفر و من دینکم فلا یخشوھم و اخشون" یعنی آج کے دن کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں' لہٰذا اب ان سے نہ ڈرو اور صرف میری مخالفت سے ڈرو' اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی۔ اور اسلام کو تمہارے دین کے طور پر قبول کیا۔ (الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا) یہ دن بڑا اہم دن ہے' اس دن چار اہم پہلو جمع ہو گئے۔ جو درج ذیل ہیں=

(۱) کفار اس روز مایوس ہو گئے۔

(۲) دین اس دن مکمل ہو گیا۔

(۳) نعمت الٰہی اس دن مکمل ہو گئی۔

(۴) خداوند عالم نے دین اسلام کو پورے عالم کے لوگوں کے لیے آخری دین کے طور پر قبول کیا۔

خدا کرد دین خود امروز کامل
کہ فرمود الیوم الیوم اکملت نازل

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں یہ دن بہت اہمیت کا حامل ہے اور یہ دن

کوئی عام اور معمولی دن نہیں ہے کیونکہ اتنی اہمیت و افادیت کسی عام دن کو حاصل نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر میں اگر کسی مکتب فکر نے اس دن کی اہمیت کو سمجھا ہے تو وہ ہے شیعہ اثنا عشریہ دین کے تکمیل کے سبب شیعہ اس دن (یوم غدیر) کو عید کا دن قرار دیتے ہیں اور شیعہ کا عقیدہ ہے کہ اس دن دین مکمل ہوگیا پھر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ ضیاء الرحمٰن فاروقی اور اس کے چیلے آیت اللہ خمینیؒ پر بہتان لگاتے ہیں۔۔۔۔۔ کہ انہوں نے حضرت خاتم النبیینؐ کی ناکامی کا اعلان کیا ہے۔

زیر بحث اشتہار کے ذریعے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ شیعہ کافر ہیں۔۔۔۔۔۔ سبائی ہیں اور ان کی جان اور ان کا مال محترم نہیں ہے ان کا ذبیحہ حرام ہے' شیعہ مرد یا عورت سے نکاح کرنا حرام ہے' ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح انہوں نے نفرت اور افتراق کا پنڈورا کھول دیا ہے۔ لیکن شیعہ علماء ہمیشہ ملت کی وحدت و یگانگت کے داعی رہے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دے وہ مسلمان ہے) اور اس کی جان اور مال محترم ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جمال الدین افغانی سے لے کر آیت اللہ خمینیؒ تک شیعہ علماء نے اتحاد اسلامی کے لیے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ہمارے ان ہی علماء میں سے ایک آیت اللہ کاشف الغطاء ہیں جنہوں نے موتمر عالم اسلامی

میں شرکت کے لیے القدس الشریف پہنچے تو موتمر کے بیشتر مندوبین نے آپ ہی کی اقتداء میں مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی تھی۔ تقریباً چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ شیعہ علماء اعلام نے اپنی رواداری اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کبھی دوسرے ملل و مذاہب پر طعن و تشنیع کرنے یا ان پر بے جا زبان اعتراض دراز کرنے میں پہل نہیں کی۔ ہاں البتہ ان کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ اگر کسی نے ان کے مذہب حق پر تقریر یا تحریر کے ذریعے سے کوئی اعتراض و ایراد کیا تو انہوں نے ہمیشہ حق جواب استعمال کرتے ہوئے دفاع کا حق ادا کیا ہے' اور مکمل و مدلل جواب بالصواب دے کر معترض کا ناطقہ بند کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔۔۔۔ بلکہ ایک ایک کتاب کے متعدد جواب دے کر اپنی علمی برتری کا سکہ جمایا' اور لوہا منوایا۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

مسئلہ تقیہ

اس اشتہار میں (تقیہ کے متعلق) شیعیان حیدر کرارؑ کا مذاق اڑایا گیا ہے' بلکہ شیعہ کو منافق کہا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الرحمن فاروقی اور اس کا وھابی ٹولہ قرآن کریم سے قطعاً ناآشنا ہیں' وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان انصاف پسند اور تحقیق کے طالب لوگوں سے (جو شیعوں اور شیعہ عقائد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں) حقائق کو چھپائیں اور یہ کہہ کر انہیں شیعوں سے متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ تقیہ اور متعہ کے قائل ہیں' اور ان کے عقائد میں بہت سے خرافات ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص تحقیق کرتا ہے' اور انصاف کا دامن تھام لیتا ہے' تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عقائد کا اسلام سے گہرا تعلق ہے' اور یہ قرآن و سنت کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی عقائد و تصورات قرآن اور سنت کے بغیر اپنی صحیح شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ البتہ تقیہ ایک وسیع موضوع ہے' اس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی

ہیں۔ یہاں اس کی تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ قرآنی آیات سے اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ جو لوگ تقیہ کی مذمت کرتے ہیں وہ درحقیت اس کی شرائط اور فلسفہ سے آگاہی نہیں رکھتے۔ مخالفین کے اس زہریلے پروپیگنڈے کے پنپنے کی وجہ یہ ہے کہ عام مسلمان اور سادہ لوح اہل اسلام اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں' اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ جس تقیہ کے قائل ہیں وہ فقط انہی سے مختص نہیں' ورنہ یہ ایک ایسا عقلی و فطری تقاضا ہے کہ جسے بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا اختلاف رنگ و نسل تمام لوگ بوقت ضرورت عمل میں لاتے رہتے ہیں۔ اگر کمزور و ناتواں انسان تقیہ سے کام نہ لیں تو وہ ختم ہو جائیں۔ اسلام جو دین فطرت ہے وہ کس طرح اس فطری حق کی نفی کر سکتا ہے۔؟ اگر تعصب و عناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے فرمان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جان کی خاطر نہ صرف عام خلاف حق بات کہنا روا ہے بلکہ کلمتہ کفر تک فقط زبان پر جاری کرنا جائز ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد قدرت ہیں=

(مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلاَّ مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ

اللّٰہِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ) (پارہ ۱۴ سورہ نحل آیت ۱۰۶)

"جو شخص اپنا ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر پر مجبور کیا جائے، مگر اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو اس سے کچھ مواخذہ نہیں۔ لیکن جو شخص ایمان پیچھے خدا کے ساتھ کفر کرکے اور کفر بھی کرے دل کھول کر ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔ (ترجمہ مولانا نذیر احمد دہلوی سنی عالم)

اس آیت مبارکہ کا شان نزول تقریباً تمام مفسرین اسلام نے یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ کفار مکہ نے جناب عمار رضی اللہ عنہ اور ان کے والد یاسر رضی اللہ عنہ والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا، صہیب، بلال رضی اللہ عنہ اور خباب کو گرفتار کرکے چند کفریہ کلمات کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام کے خلاف کفر و شرک کا اظہار کریں۔ عمار رضی اللہ عنہ کے والدین نے اس واقعے میں بڑی استقامت و پامردی دکھائی، اور ہمت و جرات سے ڈٹے رہے، لیکن ظالموں نے انہیں قتل کر دیا۔ عمار نوجوان تھے، مشرکین جو چاہتے تھے انہوں نے کہہ دیا۔ یہ خبر مسلمانوں تک پہنچی تو بعض نے غائبانہ طور پر عمار کی مذمت کی، اور کہا عمار کافر ہو گیا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام نے فرمایا ایسا مت کہو، عمار تو سر سے قدم تک ایمان سے لبریز ہے، اور ایمان اس کے گوشت و پوست میں محفوظ ہے، اسی اثناء میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ با چشم گریاں اور پریشان حال بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوئے، آنجناب

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے فرمایا' کوئی بات نہیں' اگر کفار تجھ کو مجبور کر کے یہی کلمات دوبارہ کہلوانا چاہیں تو کہہ دینا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی ج ا صفحہ ۳۹۶۔ تفسیر کبیر ج ۵ صفحہ ۳۵۵ طبع مصر) یہ آیت مبارکہ بوقت ضرورت دل میں حق کو پوشیدہ رکھ کر زبان سے خلاف حق بات کہنے (بالفاظ تقیہ کے جائز ہونے پر) ایسی نص صریح ہے کہ اسلام کا کوئی کلمہ گو انکار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ (قاضی بیضاوی اپنی تفسیر ج ا صفحہ ۳۹۶ طبع مصر میں) اسی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یہ آیت اکراہ و اجبار کے وقت کلمہ کفر کہنے کے جواز کی دلیل ہے' اور تفسیر اکلیل' جامع البیان' اور معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ مجبوری کے وقت کلمہ کفر کہنے کے جواز پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ تو پھر نہ معلوم ضیاء الرحمن فاروقی اور اس کافر ساز ٹولہ شیعوں پر کس لیے طعن و تشنیع کی کلہاڑی چلا رہے ہیں۔

نیز آیت ۲۷ سورہ آل عمران میں خداوند کریم کا ارشاد ہے۔

(لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ○)

ا''ہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ'

اور جو شخص ایسا کرے گا اس کا کسی چیز میں اللہ سے کوئی ربط نہیں ہے (یعنی اس کا رابطہ پروردگار سے بالکل ٹوٹ چکا ہے) مگر (اس تدبیر سے) ان (کی شرارت) سے بچنا چاہو (توخیر) اور اللہ تم کو اپنے (جلال) سے ڈراتا ہے اور (آخر کار) اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔" (ترجمہ نذیری)

یہ آیت بھی تقیہ کے جواز پر نص صریح ہے یہاں تو صراحتا لفظ "تقاۃ" موجود ہے جسے قراء سبعہ میں سے یعقوب قاری نے "تقیتہ" پڑھا ہے۔ تفسیر بیضاوی جلد ا' صفحہ ۱۱۲ نیز قتادہ اور ابو رجاء بھی اسے تقیتہ ہی پڑھتے تھے۔

تفسیر در منثور ج ۲ صفحہ ۱۶ مفسر بیضاوی نے ج ا صفحہ ۱۱۲ طبع مصر پر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ (ترجمہ) خداوند کریم نے تمام اوقات میں ظاہری و باطنی طور پر کفار کی دوستی کی ممانعت فرمائی ہے ہاں البتہ جب ان سے جان و مال کا خوف ہو تو اس وقت دوستی ظاہر کرنا جائز ہے۔ (تفسیر معالم التنزیل) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے مال کا احترام ان کے خون کی مانند ہے' اس لیے اس کی حفاظت کی خاطر تقیہ جائز ہے۔ جیسا کہ فاضل نیشاپوری نے اپنی تفسیر مطبوع برحاشیہ تفسیر ابن جریر ج ۳ صفحہ ۱۷۰ پر لکھا ہے (ترجمہ) من جملہ ان مقامات کے جہاں تقیہ جائز ہے ایک مال کی حفاظت بھی ہے' کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

مسلمانوں کے مال کا احترام ان کے خون کی طرح ہے۔

مخالفین فضیلت تقیہ کی جن اخبار کی وجہ سے ہم پر زبان دراز کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ ایسی روایات خود ان کی کتب میں موجود ہیں' چنانچہ کنزالعمال ج ۲ پر مرقوم ہے "لاَ دِیْنَ لِمَنْ لا تَقِیَّةَ لَهٗ" جو دشمن سے عند الضرورت تقیہ نہیں کرتا وہ بالکل بے دین ہے۔ لہٰذا جو اعتراض ہم پر کیا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ وہی خود ان حضرات پر بھی عائد ہوتا ہے۔ "فَمَاهُوَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا" بخاری شریف' ج ۲' صفحہ ۱۰۲۶ طبع دہلی پر تقاۃ کی تفسیر تقیہ کے ساتھ کرنے کے بعد لکھا ہے وَقَالَ الْحَسَنُ اَلتَّقِیَّتُهُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَتِهِ" یعنی حسن بصری کہتے ہیں کہ تقیہ قیامت تک باقی ہے۔ "لَاَنَّ حَلَالَ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمِةِ وَ حَرَامَهٗ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ" ○

مذکورہ بالا بیانات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ تقیہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو شیعوں کے ساتھ مختص ہو' تاکہ اس پر عائد کردہ شبہات کی جوابدہی کا فریضہ ان پر عائد ہو' بلکہ واضح کیا جاچکا ہے کہ یہ مسئلہ مشترکہ ہے اور عند الضرورت سب اس پر عمل کرتے رہتے ہیں' مگر تاہم چونکہ ہمیشہ ضیاء الرحمٰن فاروقی جیسے ملا ہمیں مطعون کرتے رہتے ہیں اور ابلہ فریبی کے لیے اس پر مختلف اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے ہم مناسب

سمجھتے ہیں کہ یہاں اختصار کے ساتھ ان کے ایرادات مع جوابات ذکر کریں ۔۔۔۔۔ تاکہ مسئلہ کسی لحاظ سے بھی تشنہ تکمیل نہ رہ جائے' جیسا کہ ہماری ہر مسئلہ میں یہی روش و رفتار ہے۔

شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تقیہ مثل نفاق ہے' کیونکہ ان دونوں میں یہ قدر مشترک ہے۔۔۔۔۔ کہ دل میں کچھ ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ نفاق حرام و ناجائز ہے لہٰذا تقیہ بھی ناجائز ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس بالکل بے اساس ہے۔ تقیہ اور نفاق کو ایک قرار دینا عین جہالت یا تجاہل ہے' ورنہ معمولی عقل اور علم رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ تقیہ و نفاق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ''تقیہ میں ایمان کو چھپا کر کفر کو ظاہر کیا جاتا ہے اور نفاق میں کفر' شرک کو پوشیدہ رکھ کر اسلام کو ظاہر کیا جاتا ہے'' پس جب یہ دونوں الگ الگ حقیقتیں ہیں تو پھر ایک کے حکم کا دوسرے پر چسپاں کرنا کس قانون میں جائز ہے؟ یہ قیاس تو ان لوگوں کے نزدیک بھی غلط اور ناجائز ہے جو قیاس کو درست سمجھتے ہیں۔

دوسرا شبہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب کہ اسلام کمزور تھا۔۔۔۔۔ بے شک تقیہ جائز تھا۔۔۔۔۔ مگر فتح مکہ کے بعد جبکہ اسلام و مسلمین طاقتور ہو گئے تھے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لہٰذا اب ناجائز ہے۔

یہ شبہ فریب کاری کا شکار ہے' ورنہ معمولی عقل و فکر رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ کسی حکم کا منسوخ ہوجانا اور بات ہے' اور کسی حکم کا کچھ عرصہ تک بوجہ عدم ضرورت استعمال میں نہ لانا چیزی دیگر۔ یہ ٹھیک ہے کہ فتح مکہ کے بعد ایک مرتبہ تقیہ کی ضرورت نہ رہی تھی' کیونکہ اس وقت خوف نہ تھا مگر یہ کہنا کہ اس وقت تقیہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہوگیا تھا۔ یہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کھلم کھلا افترا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی قرآنی حکم کا نسخ بغیر نص صریح کے ثابت نہیں ہوسکتا۔ ارشاد قدرت ہے۔ (مَانَنْسَخْ مِنْ آیَتِهٖ اَوْ نُنْسِهٰانَاتِ بِخَیْرٍ مِّنْهٰا وَ مِثْلِهٰا) یعنی کہ ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں تواس کی مثل یا اس سے بہتر آیت لاتے ہیں۔ علامہ سیوطی اپنی تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۲ پر رقمطراز ہیں ۔ (ترجمہ) نسخ کے سلسلہ میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ان کے کسی صحابی کی روایات صریح پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ بشرطیکہ ناسخ آیت بھی موجود ہو' بلکہ یہاں تک تصریح کر دی گئی ہے کہ نسخ کے بارے میں عوام کے لیے مفسرین کا قول کافی نہیں ہے' جب تک کہ نقل صریح موجود نہ ہو۔ بنا بریں ہم نے اس کے بلکہ آئمہ مجتہدین کا قول و اجتہاد بھی جواز کے دلائل تو قرآن و حدیث سے ذکر کر دیئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اگر ضیاء الرحمٰن فاروقی یا اس کے حامیوں میں ہمت ہے تو اس کے منسوخ ہونے پر کوئی نص قرآنی پیش کریں؟ ورنہ اس طرح بلا دلیل

قرآنی الزام تراشی کرنا اور بہتان لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

تقیہ کے مختلف اقسام ہیں' فقط یہ کہنا کہ تقیہ واجب ہے۔۔۔۔۔ یہ امر علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔۔۔۔۔ بلکہ بنا پر تحقیق محققین تقیہ احکام خمسہ پر منقسم ہوتا ہے۔ یعنی بعض اوقات واجب ہوتا ہے' بعض اوقات حرام' بعض اوقات راجح یعنی مستحب ہوتا ہے۔ بعض اوقات مرجوع و مکروہ' اور بعض اوقات فقط مباح ہوتا ہے۔

مذکور بالا حقائق سے واضح ہوگیا کہ تقیہ کا جواز بالکل بے غبار ہے۔ بلکہ یہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کے محاسن و محامد میں داخل ہے۔ اسکے جواز کا انکار سراسر جہالت و ضلالت ہے' جو کسی دیندار انسان کا شیوہ و شعار نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کو محل بے محل استعمال کرکے اسے عامتہ الناس کی نظروں میں معیوب بنا دیں۔

ہر سخن جائے دارد و مرنکتہ مقامے دارد
ہر سخن موقعہ و ہزار مقامے داد

مسئلہ بداء

بداء کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی بات آئے۔۔۔۔ جس کو کرنے کا اس کا ارادہ ہو۔۔۔ پھر اس کی رائے بدل جائے' اور پہلے جس کام کا ارادہ کیا تھا وہ اس کے بجائے کچھ اور کرے۔

اشتہار زیر بحث میں شیعوں کو مطعون کرنے کے لیے بداء کا مطلب اس طرح لیا گیا ہے کہ گویا یہ نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات میں جہل یا نقص کا۔ اور پھر کہا گیا ہے کہ شیعہ اللہ تعالیٰ کے جہل کے قائل ہیں۔

دراصل بداء کا یہ مطلب بالکل غلط ہے۔ شیعہ اس کے کبھی قائل نہیں رہے' اور جو شخص اس طرح کا عقیدہ ان سے منسوب کرتا ہے وہ افتراء پردازی کرتا ہے۔ قدیم و جدید شیعہ علماء کے اقوال اس کے گواہ ہیں=

شیخ محمد رضا مظفر اپنی کتاب ''عقائد الامامیہ'' میں لکھتے ہیں۔

اس معنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے بداء محال ہے'کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ کی لاعلمی ظاہر کرتا ہے' شیعہ اس معنی میں بداء کے ہرگز قائل

نہیں۔

حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص یہ کہتا ہے کہ بداء کے معنی ابداء ندامہ کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی کسی رائے کو غلط پا کر اور اس پر نادم ہو کر اپنی وہ رائے بدل دیتا ہے تو ایسا شخص کافر ہے۔" امام جعفر صادق علیہ السلام ہی نے فرمایا ہے=

"جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بداء کی وجہ سے اس کی لاعلمی ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

بالفاظ دیگر شیعہ جس بداء کے قائل ہیں وہ اس قرآنی آیت کے حدود کے اندر ہے۔

"یَمْحُوْاللّٰہُ مَا یَشَاءَ وَ یُثَبِّتُ وَ عِنْدَہُ اُمُّ الْکِتٰبِ"

"اور اللہ جس حکم کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اس کے پاس ہے۔" (سورہ رعد آیت ۳۹)

اس نظریہ کے اہل سنت بھی اسی طرح قائل ہیں، جس طرح شیعہ پھر شیعوں ہی پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے، سینوں پر کیوں نہیں۔؟ وہ بھی تو یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احکام میں تغیر و تبدیل کر دیتا ہے۔ موت کا وقت بدل دیتا ہے اور رزق گھٹا بڑھا دیتا ہے۔؟

کیا کوئی پوچھنے والا اہل سنت سے پوچھ سکتا ہے کہ جب سب کچھ

ازل سے ام الکتاب میں لکھا ہوا ہے' تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق یہ تغیر و تبدیل کیوں کرتا رہتا ہے۔ ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس آیت "یَمْحُوْا اللّٰہَ مَا یَشَاءُ وَ یُثَبِّتُ عِنْدَہُ اُمُّ الْکِتٰابِ" کے بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ میں اس کا ایسا مطلب بیان کروں گا کہ خوش ہو جاؤ گے' اور میرے بعد میری امت کی آنکھیں بھی اس سے ٹھنڈی ہوں گی۔ اگر صدقہ صحیح طریقہ سے دیا جائے۔۔۔۔۔ والدین کے ساتھ نیکی کی جائے۔۔۔۔۔۔ کسی پر احسان کیا جائے۔۔۔۔۔ تو یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ ان سے بد بختی خوش بختی میں بدل جاتی ہے' عمر بڑھتی ہے اور بری موت سے حفاظت رہتی ہے۔

خداوند عالم کے دو نظام ہیں۔ ایک نظام تشریعی ۔ دوسرا نظام تکوینی ۔ نظام شریعت میں جس چیز کا نام "نسخ" ہے (جس کے سب مسلمان قائل ہیں) کہ شرعی احکام حالات و ظروف کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں" اس چیز کا نام نظام تکوینی میں بداء ہے کہ انسان کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدل دیتا ہے۔ گدا کو شاہ' شاہ کو گدا ۔ فقیر کو امیر' امیر کو فقیر' تندرست کو بیمار' بیمار کو تندرست وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ کوئی عقل مند و بابصیرت انسان اس کے انکار کرنے کی جرات نہیں کرسکتا کہ خداوند کریم قادر مطلق ہے۔ اللہ کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں۔

"یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَ یَحْکَمُ مَا یُرِیْدُ" چونکہ اس عقیدہ سے یہودیوں کے اس نظریہ باطلہ کی زبردست تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ خدا نے اپنے خدائی اختیارات اپنے بعض خاص بندوں کو تفویض کر دیئے ہیں اور اب خود بیکار ہے "یَدُاللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ" اس طرح ان بعض نام نہاد مسلمانوں کے خیالات فاسدہ کا بھی ابطال ہوتا ہے جو کہتے ہیں "جَفَّ الْقَلَمَ بِمَا کَانَ وَ مَا ھُوَ کَائِنٌ" یعنی قلم قدرت خشک ہو چکا ہے اور نوشتہ ایزدی میں کسی قسم کا تغیرو تبدل نہیں ہو سکتا۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ اب معاذ اللہ خدا سلب الاختیار ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے یَمْحُوْااللّٰہَ مَا یَشَاءَ وَ یُثِبَّتُ وَ عِنْدَ اُمُّ الْکِتٰابِ" یعنی خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے۔ اسی کے پاس اُم الکتاب ہے۔

چونکہ اس عقیدہ صحیحہ سے خدا کی قدرت مطلقہ اور سلطنت عظمی الہیہ اور اختیارات وسیعہ کا بہت اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے آئمہ معصومین علیہ السلام نے اس عقیدہ پر بہت زور دیا ہے اور اسے خدا کی سب سے بڑی عبادت قرار دیا ہے ظاہر ہے کہ اگر بداء نہ ہوتا تو دعا و تصدیق و خیرات اور شفاعت و توسل اور دربار الٰہی میں گریہ و زاری کا کوئی مقصد ہی باقی نہ رہتا؟ بہ۔ یہ تمام سلسلہ عبث اور بے فائدہ ہو کر رہ جاتا۔

شیعہ کے لیے شریعت مقدسہ میں اگر کوئی حجت ہے تو صرف

قرآن کریم یا سرکار محمد و آل محمد علیہم السلام کا فرمان اور بس۔ اور جب وہ دونوں بداء کی حقانیت اور صداقت پر شاہد ہیں اور عدلین کے طور پر ناطق ہیں، تو پھر اس کے صحیح ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اور ضیاء الرحمٰن فاروقی جیسے خود ساختہ عالم کے انکار سے اس کی صداقت کسی طرح مشتبہ نہیں ہو سکتی۔

اے کاش! ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب اور ان کے نیم خواندہ ملاؤں کو عقل آجائے۔ وہ اندھے تعصب کو چھوڑ دیں اور مخالفت میں بھی جذبات سے کام نہ لیں، تاکہ ہر بحث میں فیصلہ جذبات کے بجائے عقل سے ہو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بحث و جدال میں قرآن کریم کا اسلوب اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل کی تھی۔ کہ وہ اپنے مخالفین سے کہہ دیں کہ:

(وَ اَنَا اَوْ اَبَاکُمْ لَعَلٰی هُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٌ

کہہ دیجئے! یا ہم ہدایت پر ہیں یا تم۔ اسی طرح یا ہم گمراہی میں ہیں یا تم۔ یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کی قدر و منزلت بڑھا دی اور خود ان کی سطح پر آنا منظور فرمایا تاکہ مشرکین کے ساتھ انصاف ہو اور اگر سچے ہوں تو انہیں بھی اپنے دلائل پیش کرنے کا موقع مل سکے۔ اب ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم ان اعلیٰ اخلاق پر کہاں تک عمل پیرا ہیں۔؟

توحید الشیعہ

تمام مخلوقات مادی و روحانی اور تمام مکنونات ارضی و سماوی کی مالک و خالق اور محی ممیت ذات مستجمع جمیع صفات کمال اور بے مثل و بے مثال ہستی کا نام "اللہ" ہے جو جسم و جسمانیت اور مکان و مکانیات سے منزہ و مبرا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے واحد و یگانہ ہے۔ اس کی ذات و صفات اور افعال و عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ ابدی و ازلی اور لم یلد و لم یولد کا مصداق ' اللہ ہر شئی پر قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ اور ہر چیز کا علمی احاطہ رکھتا ہے--- وہی معبود برحق ہے --- اس کے سوا اور کسی کی عبادت روا نہیں ہے --- ساری کائنات اس کی محتاج ہے---- اس کے کمالات ذاتی ہیں --- اسی کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات کی بست و کشاد اور اس کے نظم و نسق کی باگ دوڑ ہے ---- وہ ایسا عادل و منصف ہے کہ جو ظلم و جور کا ارادہ بھی نہیں کرتا-- اس نے یہ تکوینی امور کسی کے سپرد نہیں کئے۔ وہ کسی چیز میں حلول نہیں کرتا۔ نہ کوئی حوادث اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور

نہ دنیا و آخرت میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔

" لا تدركه الابصار وهو يدرک الابصار وهو اللطيف الخبير سبحان من هو ہكذا ولا هكذا غيره كذلک الله ربی كذلک الله ربی - كذالک الله ربی"

شان رسالت عند الشیعہ

نبیؐ و رسولؐ اس انسان کامل کو کہا جاتا ہے جس کا دامن تمام امکانی کمالات سے متصف اور تمام صفات رذیلہ سے مبرا ہو' اور مہد سے لحد تک' ہر قسم کے گناہ و عصیان سے منزہ ہو۔ شرف مکالمہ ربانی و وحی رحمانی سے مشرف ہو' اور تبلیغ احکام و نیل مرام میں خالق و مخلوق کے درمیان وسیلہ ہو۔ اس لیے اس کے لیے دو جنبوں کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ایک جنبہ نورانی و روحانی' جس کی بنا پر وہ خدا سے احکام حاصل کرسکے اور دوسرا جنبہ بشری و جسمانی ہے جس کی بناء پر لوگوں تک وہ احکام پہنچا سکے۔ اور امور تکوینی میں لوگوں کی عرض داشتیں سن کر ان کو رب جلیل کی بارگاہ میں پیش کرکے بذریعہ سفارش و شفاعت منظور کراسکے۔ اس کی اطاعت خدا کی اطاعت اور اس کی نافرمانی خدا کی نافرمانی متصور ہوتی ہے۔ اس کا ہر قول و فعل وحی الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

خدائے حکیم نے ہدایت خلق کے لیے بہت سے انبیاء و مرسلینؑ بھیجے اور سب سے آخر سرکار ختمی مرتبت حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاجدار ختم نبوت بنا کر بھیجا' جو تمام انبیاء و مرسلین کے انفرادی کمالات کے مع شیئی زائد جامع تھے۔ جو ذات و صفات کے اعتبار سے اس قدر عظیم المرتبت تھے کہ کفار بھی باوجود کوشش بسیار کے ان میں کسی نقص و عیب کی نشاندہی نہ کر سکے۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کے صحیح مصداق ہیں۔ جس طرح الہ و خدا ہونے کے لحاظ سے خدا بے مثل و بے مثال ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما ینطق عن الھوی کے مصداق بھی ہیں اور لولاک لما خلقت الافلاک کے تاجدار بھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت مطلقہ واجب ہے' اور دخول جنت و نار کا دارومدار انہی کی فرمانبرداری اور نافرمانی پر ہے۔ جنہوں نے ان کی اتباع کی وہ "فَازُوْا اَوْ سُعِدُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" ہیں مگر ان کی تعداد پہلے بھی بالکل قلیل تھی اور اب بھی قلیل ہے۔۔ وَ قَلِیْلٌ مِنْ عِبَادِیَ الشُّکُوْر

معینہ مدت کا نکاح

جس طرح تمام مسلمان فرقوں میں نکاح کے لیے یہ شرط ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی طرف سے ایجاب و قبول کیا جائے' اور حق مہر معین کیا جائے اس طرح سے متعہ میں بھی مہر کو معین کیا جانا ضروری ہے۔ نیز طرفین کی طرف سے ایجاب و قبول بھی شرط ہے۔

مثلاً

لڑکی لڑکے سے کہے: "زَوَّجْتُكَ نَفْسِی بِمَهْرٍ قَدْرِهِ كَذَا وَ لِمُدَّةٍ كَذَا اس پر لڑکا کہے قَبِلْتُ یا کہے رَضِیْتُ (کذا اور کذا کی بجائے مہر کی رقم اور متعہ کی مدت بولے)

شریعت اسلامیہ میں عام طور سے جتنی شرطیں نکاح کے لیے مقرر کی گئیں ہیں' کم و بیش وہ تمام شرطیں متعہ کے لیے بھی مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً جس طرح محرم سے یا ایک ہی وقت میں دو بہنوں سے نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح متعہ بھی نہیں ہو سکتا اور جس طرح بعض فقہا کے نزدیک اہل کتاب سے نکاح جائز ہے' اسی طرح متعہ بھی جائز ہے اور جس طرح نکاح کے بعد

طلاق ہو جانے پر منکوحہ کے لیے عدت ضروری ہے (جس کے بعد ہی وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے اسی طرح ممتوعہ بھی متعہ کے بعد عدت میں بیٹھتی ہے' اور عدت پوری کرنے کے بعد ہی دوسرا متعہ یا نکاح کر سکتی ہے۔ ممتوعہ کی عدت دو طہر یا پینتالیس دن ہے' لیکن شوہر کے مرجانے کی صورت میں یہ مدت چار ماہ دس دن ہے۔

متعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ نفقہ ہے نہ میراث اس لیے متعہ کرنے والے مرد اور عورت ایک دوسرے سے میراث نہیں پاتے۔ متعہ سے پیدا ہونے والے بچے نکاح سے پیدا ہونے والے بچوں کی طرح حلالی ہوتے ہیں' اور انہیں عام بچوں کی طرح میراث اور نفقہ (روٹی' کپڑا' مکان دوا دارو وغیرہ) کے تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں' اور ان کا نسب باپ سے چلتا ہے۔

یہ ہیں متعہ کے شرائط اور حدود۔ اس کا حرام کاری سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ جیسا کہ بعض غلط الزام لگانے والے اور شور مچانے والے سمجھتے ہیں۔

اپنے شیعہ بھائیوں کی طرح اہل سنت والجماعت کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ النساء کی آیت 24 میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعہ کی تشریح کی گئی ہے۔ آیت یہ ہے=

"فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا"

"پس جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہے تو انہیں جو مہر مقرر کیا ہے دے دو' اور مہر کے مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں (کم و بیش پر) راضی ہو جاؤ تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا ہر چیز سے واقف اور مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔"

اسی طرح اس روایت پر شیعہ اور سنی دونوں مذاہب کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کی اجازت دی تھی' اور صحابہ کرام نے عہد نبویؐ میں متعہ کیا تھا۔

امت اسلامیہ میں اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ کیا متعہ کا حکم منسوخ ہوگیا یا اب بھی باقی ہے؟ اہل سنت اس کے منسوخ ہو جانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے متعہ حلال تھا۔۔۔۔۔ پھر حرام قرار دیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نسخ حدیث سے ہوا ہے۔ قرآن سے نہیں۔۔۔۔۔ اس کے برخلاف شیعہ کہتے ہی کہ متعہ منسوخ ہی نہیں ہوا۔ یہ قیامت تک جائز رہے گا۔ فریقین کے اقوال پر ایک نظر ڈالنے سے حقیقت واضح ہو جائے گی اور قارئین با تمکین کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ تعصب اور جذبات سے بالا تر

ہو کر حق کا اتباع کر سکیں۔

شیعہ جو یہ کہتے ہیں کہ متعہ منسوخ نہیں ہوا اور قیامت تک جائز رہے گا' اس کے متعلق ان کے پاس بین دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی متعہ سے منع کیا ہو۔

اس کے علاوہ ہمارے آئمہ ؑ جو عترت طاہرہ سے ہیں---- وہ بھی متعہ کے حلال اور جائز ہونے کے قائل ہیں۔ اگر متعہ منسوخ ہو گیا ہوتا تو آئمہ اہل بیت ؑ کو اور خصوصاً حضرت علی علیہ السلام کو ضرور اس کا علم ہوتا۔ کیونکہ گھر کا حال گھر والوں سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے؟

شیعہ کے نزدیک جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے اپنے عہد خلافت میں متعہ کو حرام قرار دیا تھا۔ لیکن یہ ان کا اپنا اجتہاد تھا۔ اس بات کو علمائے اہل سنت بھی تسلیم کرتے ہیں' لیکن ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کو حضرت عمر بن خطاب کی رائے اور اجتہاد کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے۔

یہ ہے متعہ کے بارے میں شیعوں کی رائے کا خلاصہ ۔ جو بظاہر بالکل درست اور صحیح ہے کیونکہ سب مسلمان اللہ اور اس کے رسول ؐ کے احکام کی پیروی کرنے کے مکلف ہیں۔ کسی اور کی رائے کے پابند نہیں ہیں۔ خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ خصوصاً جب کہ اس کا اجتہاد قرآن و

حدیث کی نصوص کے خلاف ہو۔

اس کے بر عکس اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ متعہ پہلے حلال تھا۔ اور اس کے متعلق قرآن میں آیت بھی آئی ہے اور رسول اللہؐ نے اس کی اجازت بھی دی تھی اور صحابہ نے اس پر عمل بھی کیا تھا لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ کس نے منسوخ کیا؟ اس میں اختلاف ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی وفات سے قبل منسوخ کیا تھا۔ لیکن یہ بات وثوق سے معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کب منسوخ کیا تھا؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ روز خیبر' اور کچھ کہتے ہیں کہ روز فتح مکہ' اور کچھ کہتے ہیں کہ غزوہ تبوک میں' اور کچھ کہتے ہیں کہ حجتہ الوداع میں' کچھ کہتے ہیں عمرۃ القضا میں' رسولؐ نے اسے منسوخ کیا تھا۔ یہ تمام تفاصیل تفسیر کبیر' تفسیر نیشاپوری اور منادی شرح جامع صغیر میں مذکور ہیں۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غریب متعہ پر بڑے بڑے انقلاب آئے۔ کئی بار حلال ہوا اور کئی بار حرام۔

بعض سنی علماء کا کہنا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے متعہ کو حرام کیا اور ان کا حرام کرنا ہمارے لیے حجت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ میری سنت اور میرے بعد آنے والے خلفائے راشدین کی سنت پر

چلو اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑلو۔

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ متعہ اس لیے حرام ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے اسے حرام کیا تھا اور سنت عمر کی پابندی اور پاسداری ضروری ہے تو ایسے لوگوں سے تو کوئی گفتگو اور بحث بیکار ہے کیونکہ ان کا یہ قول محض تعصب اور تکلف بے جا ہے، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ کہ کوئی مسلمان اللہ اور رسول ؐ کا قول چھوڑ کر، اور ان کی مخالفت کر کے کسی ایسے مجتہد کی رائے پر چلنے لگے جس کی رائے بنا بر بشریت صحیح کم ہوتی ہے، اور غلط زیادہ۔ یہ صورت بھی اس وقت ہے جب اجتہاد کسی ایسے مسئلے میں ہو جس کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی تصریح نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی تصریح موجود ہو تو حکم خداوندی یہ ہے۔

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا"

"جب اللہ اور رسول ؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر اس بات میں کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کو کوئی اختیار نہیں۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی نافرمانی کی وہ بالکل گمراہ ہو گیا۔" (سورہ الاحزاب آیت 36)

جسے اس قاعدہ و اصول پر اتفاق نہ ہو' اس کے لیے اسلامی قوانین کے بارے میں اپنی معلومات پر نظر ثانی کرنا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا ضروری ہے' کیونکہ قرآن خود مذکورہ بالا آیت میں بتلاتا ہے کہ جو قرآن اور سنت کو حجت نہیں مانتا وہ کافر اور گمراہ ہے اور ایک ایسی آیت پر کیا موقوف ہے قرآن میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں۔

اسی طرح اس بارے میں احادیث بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یہاں اختصار کے سبب ایک حدیث نبوی ؐ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جس چیز کو محمد ؐ نے حلال کیا وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جس چیز کو محمد ؐ نے حرام کیا وہ قیامت تک کے لیے حرام ہے"

اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ایسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں فیصلہ کرے جس کے متعلق اللہ یا اس کے رسول ؐ کا حکم موجود ہو۔

تکمیل دیں کے بعد نہ ترمیم سوچئے
بندہ نواز! آپ رسالت ؐ نہ کیجئے

اس کے باوجود بھی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ خلفائے راشدین کے افعال و اقوال اور ان کے اجتہادات پر علم ہمارے لیے

ضروری ہے ان سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ:

"کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو؟ وہ تو ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے اور ہم تو اسی کے لیے خالص ہیں۔"

(سورۂ البقرہ آیت 139)

واضح رہے کہ حدیث سے قرآن کا حکم منسوخ نہیں ہوتا کیونکہ قانون سازی انبیاء کا کام نہیں ہے۔ ان کا کام فقط یہ ہے کہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون اس کے بندوں تک پہنچا دیں۔ وما علی الرسول الا البلاغ المبین۔

ہماری اس بحث کا تعلق صرف اس گروہ سے ہے جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود متعہ کو حرام قرار دیا تھا اور یہ کہ قرآن کا حکم حدیث سے منسوخ ہو گیا۔

مگر ان لوگوں کے افعال میں بھی تضاد ہے اور ان کی دلیل کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں۔ اگرچہ ممانعت کی روایت صحیح مسلم میں آئی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کی ممانعت فرما دی تھی تو اس کا علم ان اصحاب کو کیوں نہیں ہوا جنہوں نے عہد حضرت ابوبکر صدیق اور عہد حضرت عمر کے اوائل میں متعہ کیا۔ جیسا کہ اس کی

روایت خود صحیح مسلم میں ہے۔ (صحیح مسلم جلد 4 صفحہ 158)

"عطا کہتے ہیں کہ جابر بن عبداللہ انصاری عمرہ کے لیے آئے تو ہم ان کی قیام گاہ پر گئے لوگ ان سے ادھر ادھر کی باتیں پوچھتے رہے پھر متعہ کا ذکر چھڑ گیا جابر نے کہا ہاں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی متعہ کیا ہے اور ابو بکر اور عمر کے عہد میں بھی۔"

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعہ کی ممانعت کر چکے ہوتے تو پھر حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر کے زمانے میں صحابہ کے لیے متعہ کرنا جائز نہ ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کی ممانعت کی تھی اور نہ اسے حرام قرار دیا تھا' ممانعت تو حضرت عمر بن خطاب نے کی تھی جیسا کہ صحیح بخاری میں آیا ہے=

"ابو رجاء نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ ابن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ متعہ کی آیت کتاب اللہ میں نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم نے اس وقت متعہ کیا' جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ قرآن میں کبھی متعہ کی حرمت نازل نہیں ہوئی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات تک متعہ سے منع کیا۔ اس کے بعد ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کیا۔" محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے تھے کہ ایک شخص سے مراد حضرت عمر ہے۔ (صحیح بخاری جلد ۵ صفحہ 158)

اب دیکھئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات تک متعہ سے منع نہیں کیا جیسا کہ یہ صحابی تصریح کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ نہایت صاف الفاظ میں اور بغیر کسی ابہام کے متعہ کی حرمت کو حضرت عمر سے منسوب کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے جو کچھ کہا اپنی رائے سے کہا۔ اور ملاحظہ ہو:

"جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اور حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں ایک مٹھی کھجور یا ایک مٹھی آٹے کے عوض متعہ کیا کرتے تھے۔ آخر حضرت عمر نے عمرو بن حریث کے قصے میں اس کی ممانعت کر دی۔ (صحیح مسلم جلد 4 صفحہ 134)

اس کے علاوہ اور ملاحظہ ہو۔ (صحیح مسلم جلد 4 صفحہ 131)

"ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں جابر کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ ابن عباس اور ابن زبیر کے درمیان متعتین کے بارے میں اختلاف ہو گیا ہے اس پر جابر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہم نے دونوں متعے کئے ہیں۔ بعد میں عمر نے ہمیں منع کر دیا تو پھر ہم نے کوئی متعہ نہیں کیا۔

اس لیے غالباً بعض علماء نے ذاتی طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

بعض صحابہ نے جو متعہ کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کی ہے اس کا مقصد محض عمر کی رائے کی تصویب اور تائید تھا ورنہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایسی چیز کو حرام قرار دیں جسے قرآن نے حلال ٹھہرایا ہو۔ تمام اسلامی احکام میں ایک بھی ایسا حکم معلوم نہیں کہ اللہ جل شانہ نے کسی چیز کو حلال کیا ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے حرام کر دیا ہو۔ اس امر کلیہ کا کوئی مسلمان بھی قائل نہیں۔ البتہ معاند اور متعصّب کی بات اور ہے۔

اگر محض بحث برائے بحث یہ مان لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کی ممانعت فرما دی تھی تو حضرت علی علیہ السلام کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص مقرب ہونے کے باوجود اور اسلامی احکام کی سب سے زیادہ واقفیت رکھنے کے باوصف فرما دیا:

"متعہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بندوں پر اس کا خاص احسان ہے۔ اگر عمر اس کی ممانعت نہ کر دیتے تو کوئی بدبخت زنا نہ کرتا۔" (تفسیر ثعلبی، تفسیر طبری)

اس کے علاوہ خود حضرت عمر بن خطاب نے بھی یہ نہیں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کی ممانعت کر دی تھی بلکہ صاف صاف یہ کہا تھا کہ:

(مُتْعَتَانِ كَانَتَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاَنَا اَنْهٰى عَنْهُمَا وَ اُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا مُتْعَةَ الْحَجِّ وَ مُتْعَةَ النِّسَاءِ ○

"دو متعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھے' اب میں ان کی ممانعت کرتا ہوں اور جو یہ متعے کرے گا اسے سزا دوں گا۔ ان میں ایک متعہ حج ہے اور دوسرا عورتوں کے ساتھ متعہ ہے۔ حضرت عمر بن خطاب کا یہ قول مشہور ہے۔"

مسند امام حنبل اس بات کے بہترین گواہ ہے کہ اہل سنت والجماعت میں متعہ کے بارے میں سخت اختلاف ہے' کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرتے ہوئے اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں' اور کچھ لوگ عمر بن خطاب کی پیروی میں اسے حرام کہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے روایت کی ہے کہ:

"ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعہ کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔ تو عمرو بن زبیر نے کہا۔ متعہ سے تو ابو بکر اور حضرت عمر نے منع کر دیا تھا۔ ابن عباس بولے' یہ عروہ کا بچہ کیا کہتا ہے؟ کسی نے کہا۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے متعہ سے منع کر دیا تھا۔ ابن عباس نے کہا مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ یہ لوگ جلد ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ابوبکر اور عمر نے منع کر دیا۔ (مسند امام احمد بن حنبل جلد 11 صفحہ 337)

عبداللہ بن عمر سے حج کے متعہ کے بارے میں کسی نے سوال کیا تو انہوں نے کہا جائز ہے۔ پوچھنے والے نے کہا' آپ کے والد نے تو اس سے منع کیا تھا۔ ابن عمر نے کہا' تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میرے والد تمتع سے منع کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود تمتع کیا ہو تو میں اپنے والد کی پیروی کروں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی؟ اس نے کہا ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی۔ (جامع ترمذی جلد اول صفحہ 157)

اہل سنت والجماعت نے عورتوں کے متعہ کے بارے میں تو حضرت عمر کی بات مان لی لیکن متعہ حج کے بارے میں ان کی بات نہیں مانی۔ حالانکہ حضرت عمر نے ان دونوں سے ایک ہی موقع پر منع کیا تھا۔ جیسا کہ مندرہ بالا سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔

اس پورے قصے میں اہم بات یہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں نے حضرت عمر کی اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ دونوں متعے قیامت تک حلال اور جائز رہیں گے۔ کچھ علمائے اہل سنت نے بھی اس بارے میں آئمہ اہل بیتؑ کا اتباع کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تیونس کے مشہور عالم اور زیتونہ یونیورسٹی

کے سربراہ شیخ طاہر بن عاشور رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے اپنی مشہور تفسیر "التحریر والتنویر" میں آیت متعہ فما استمتعتم به منهن کی تفسیر کے ذیل میں متعہ کو حلال کہا ہے۔

(التحریر والتنویر جلد 3 صفحہ 5)

علماء کو اسی طرح اپنے عقیدہ میں آزاد ہونا چاہیے۔ جذبات اور عصبیت سے متاثر نہیں ہونا چاہیے' اور نہ کسی کی مخالفت کی پروا کرنی چاہیے۔۔۔۔۔ اس معاملے میں فیصلہ کن اور ناقابل تردید دلائل شیعوں کی تائید میں موجود ہیں جن کے سامنے انصاف پسند اور ضدی طبیعت رکھنے والے دونوں کو سر تسلیم ختم کرنا پڑتا ہے۔

"اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلاَ یُعْلٰی عَلَیْهِ"

"حق ہی غالب رہتا ہے۔ کوئی اسے مغلوب نہیں کر سکتا"

مسلمانوں کو تو حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ متعہ رحمت ہے۔ اور یہ اللہ کا احسان ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کیا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب اور ان کے تائید کرنے والے نیم ملاؤں نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر کے متعہ و زنا کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور عداوت اہل بیتؑ کے جوش میں آکر اس امر کو بھی نظر انداز کیا کہ ابتدائے اسلام میں تو سب مسلمانوں کے نزدیک

متعہ جائز و حلال تھا۔ اختلاف صرف اس کے بعد ممنوع و منسوخ ہونے میں ہے۔ تو کیا خداوند کریم اور رسول مقبولؐ نے اوائل اسلام میں زنا کو جائز اور حلال قرار دے کر رائج کیا تھا؟ اور یہ کہ ضیاء الرحمٰن فاروقی کے اس فتویٰ کی زد میں کون کون بزرگ آجاتے ہیں۔ فاروقی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جوش کے ساتھ ہوش کی بھی ضرورت ہے ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

حالات کی کس قدر ستم ظریفی ہے کہ وہ متعہ جس کی حلیت و تشریح سے اصلی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ جب بوجہ سفر' گھر سے دوری کے سبب' جنسی گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو' اس جائز طریقہ پر تسکین حاصل کرکے مسلمان گناہ سے بچ سکتا ہے۔ آج اسے زنا قرار دیا جا رہا ہے۔ الغرض متعہ کی تشریح زنا کی روک تھام کے لیے ہوئی ہے۔ اسی بناء پر حضرت علیؑ اور ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ "اگر عمر متعہ کو ممنوع نہ کرتے تو سوائے کسی بدبخت کے کوئی زنا نہ کرتا۔"

واقعی اس سے بڑی رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ متعہ شہوت کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھاتا ہے' جو کبھی کبھی انسان کو مرد ہو یا عورت اس طرح بے بس کر دیتی ہے کہ وہ درندہ بن جاتا ہے۔ کتنی ہی عورتوں اور بچوں کو مرد

شہوت کی آگ بجھانے کے بعد محض گناہ کو چھپانے کی خاطر قتل کر دیتے ہیں۔

جب خدائے غفور الرحیم نے اپنے بندوں کو اپنے فضل و کرم سے متعہ کی اجازت دے دی ہے تو اب زنا وہی کرے گا جو بالکل ہی بدبخت ہو گا۔ اللہ کے دین میں ہر طرح کی آسانی ہے مشکل کا نام نہیں۔ اللہ نے ہمارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی ہے۔

امامت رحمت ہے۔ عصمت آئمہ کا عقیدہ رحمت ہے بداء رحمت ہے۔ قضاء و قدر (سے متعلق شیعہ جو کچھ کہتے ہیں) رحمت ہے، تقیہ رحمت ہے۔ نکاح متعہ رحمت ہے، مختصر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ حق ہے کہ جس کی تعلیم خاتم النبیین حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی جو رحمتہ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جن روایات سے حکم متعہ منسوخ ہونے کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ بہت اختلافی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حضور نے بہ نفس نفیس اس حکم کو منسوخ فرمایا تھا۔ لہٰذا اس کی ناسخ سنت و حدیث پیغمبرؐ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ناسخ آیت طلاق ہے۔

"اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْا هُنَّ لِعِدَتِهِنَّ"

"جب تم عورتوں کو طلاق دو تو طلاق عدت کے مناسب زمانہ میں

ہو۔"

جبکہ یہ آیت زیر بحث مسئلے سے کوئی ربط نہیں رکھتی۔ کیونکہ یہ آیت طلاق کے بارے میں بحث کرتی ہے اور نکاح موقت (متعہ) میں سرے سے طلاق ہوتی ہی نہیں' بلکہ اس میں مدت متعہ ختم ہونے کے بعد خود بخود علیحدگی ہو جاتی ہے۔ قدر مشترک و مسلم یہ ہے کہ اس قسم کے نکاح کا مشروع اور جائز ہونا عہد پیغمبرؐ میں قطعی ہے اور کسی قسم کی قابل اعتماد دلیل اس کے منسوخ ہونے پر نہیں ملتی۔

بنا براین علم اصول کے قانون کے مطابق جو حد ثبوت تک پہنچا ہوا ہے' قانون متعہ کی بقا ثابت ہوتی ہے۔ خود حضرت عمر کا مشہور جملہ جو نقل کیا جا چکا ہے' اس حقیقت پر واضح گواہ ہے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ کوئی شخص بھی احکام منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ صرف آپؐ ہی کی ذات خدا کے حکم سے کچھ احکام کو منسوخ کر سکتی ہے' اور پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد نسخ کا دروازہ کلی طور پر بند ہو چکا ہے' ورنہ ہر شخص اپنے اجتہاد سے احکام کو منسوخ کر سکتا ہے اور پھر کوئی چیز بھی شریعت میں ابدی اور جاودانی کے نام سے باقی نہیں رہ سکتی اور اصولی طور پر پیغمبر اکرمؐ کے ارشادات کے مقابلے میں اجتہاد دراصل نص کے مقابلے میں اجتہاد ہے جو قابل اعتبار و وثوق نہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد 3 صفحہ 245)

نماز کے بارے میں اختلاف کا اجمالی نقشہ

ہائے اسلام تیری رام کہانی نہ اب سنی جاسکتی ہے اور نہ سنائی جاسکتی ہے۔ تیرے اپنے نام نہاد نام لیواؤں ضیاء الرحمٰن فاروقی اور اس کے وہابی پیرووں نے اس طرح تیرا پر نور حلیہ بگاڑا ہے کہ تجھے غیر مسلموں میں روشناس کرانا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلام کے مضبوط ستون نماز ہی کو لیجئے جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے تیس سال تک ہر دن رات میں پانچ مرتبہ سفر میں، حضر میں، خلوت میں اور ہزاروں صحابہ کرام اور عوام الناس کے مجمع عام میں پڑھتے رہے، مگر مسلمان آج تک اس بات کا فیصلہ بھی نہیں کر سکے کہ آنحضرتؐ کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ آیا ہاتھ کھول کر پڑھتے یا ہاتھ باندھ کر اور اگر ہاتھ باندھ کر پڑھتے تھے تو ہاتھ کہاں باندھتے تھے؟

تو اس سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے درمیان بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

1۔ ہاتھ کھول کر پڑھتے تھے۔ (امام مالک)

2۔ باندھ کر پڑھتے تھے لیکن ہاتھ ناف کے نیچے رکھتے تھے (امام اعظم)

3۔ باندھ کر پڑھتے تھے، مگر ہاتھ ناف کے اوپر لیکن پیٹ پر رکھتے تھے۔

(امام شافعی)

4۔ ہاتھ باندھ کر پڑھتے تھے مگر سینہ کے اوپر۔ (امام احمد بن حنبل)

یہ اختلاف اس بات کا نتیجہ و ثمرہ ہے کہ مسلمانوں نے ان ذوات مقدسہ سے اسلامی احکام اور بانی اسلام کے کردار کو حاصل نہیں کیا، جن کے گھروں میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اور جو سفر و حضر اور خلوت و جلوت میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کے دم ساز و ہمراز تھے، بلکہ اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ و عمل معلوم کیا۔۔۔۔۔ جن کی ولادتیں ہی پیغمبر اسلامؐ کے قریباً ایک صدی یا اس سے بھی کچھ عرصہ بعد ہوئیں۔؟

بہرحال دین کے مسائل میں قیاسات و خیالات کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے اسوہ نبویؐ کی اتباع و پیروی ضروری ہے اور اس کے لیے پہلے آپ کے طریقہ کا تعین لازم ہے۔ جو کچھ کتب فریقین سے واضح و آشکار ہے "وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے" ہاتھ باندھنے کے متعلق شیعہ تو کیا کتب اہل سنت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی مرفوع قوی حدیث موجود نہیں ہے اور نہ ہی اہل سنت کے اصول درایہ کے مطابق کسی صحیح السند حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا ثابت

ہے۔

فتاوی شیخ عبدالحی لکھنوی ج1 صفحہ 326 طبع اول میں منقول ہے کہ جناب معاذ بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھنے کے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے وقت ہاتھوں کو کانوں تک بلند کرتے اور پھر ان کو کھلا چھوڑ دیتے۔

2۔ عینی شرح کنز الدقائق صفحہ 25 طبع نو لکشور حاشیہ صفحہ 526 پر یہ قول نقل کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ انگلیوں کے سروں میں خون اتر آتا تھا۔

3۔ سنن ابوداؤد صفحہ 109 میں ابن عباس سے مروی ہے کہ اگر تو پسند کرے کہ رسولؐ خدا کی نماز دیکھے تو ابن زبیر کی اقتداء کر۔ فیل الاوطار ج 2 صفحہ 711 تسہیل القاری پ ۲ صفحہ ۸۴۰ میں مذکور ہے کہ ابن زبیر ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے۔

من جملہ ان قطعی دلائل کے جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بانی اسلامؐ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے ایک یہ ہے کہ عترت رسولؐ کا عمل بھی اسی طریقہ پر تھا۔ تاہم ضیاء الرحمٰن فاروقی جیسے شکی لوگوں کے ازالہ شکوک و اوہام کی خاطر فریقین کی کتب معتبرہ سے اسوۂ اہل بیتؑ کا ثبوت پیش

کیا جاتا ہے=

1۔ علامہ وحید الزمان اپنی کتاب تسہیل القاری شرح صحیح بخاری پ ۳ صفحہ ۸۴۰ ' ۸۴۷ پر نماز میں ہاتھ باندھنے کا عدم وجوب ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اگر واجب ہوتا تو اہل بیت کرام اس کو کیونکر ترک کرتے۔ پس یہ ترک دلیل ہے اس کی سنت ہونے کی۔ (پھر لکھا) با جملہ امام مالک اور امام محمد باقر اور براہیم نخعی اور عبداللہ بن زبیر اور حسن بصری اور لیث بن سعد اور اوزاعی و غیرھم سے ارسال یعنی ہاتھ کھول کر پڑھنا منقول ہے تو معلوم ہوا کہ اوائل اسلام میں امت میں اس مسئلہ میں اختلاف تھا۔ (کذافی العینی شرح البخاری ج 3 صفحہ ۔ 15) جس دلیل سے علامہ صاحب نے ہاتھ باندھنے کا عدم وجوب ثابت کیا ہے یعنی یہ کہ اگر واجب ہوتا تو اہل بیتؑ اس کو ترک نہ کرتے بعینہ اسی دلیل سے ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ فعل سنت بھی نہیں ہے ورنہ آئمہ اہل بیتؑ ہرگز سنت رسولؐ سے روگردانی نہ کرتے۔

2۔ امام شوکانی نے نیل الاوطار جلد 2 صفحہ 76 طبع مصر پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عترت رسولؐ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کے قائل تھے۔ اور جہاں تک شیعی کتب سے ثبوت کا تعلق ہے وہ تو عیان

راچہ بیان کا مصداق ہے۔

3۔ فروع کافی جلد 1' صفحہ 181 جناب حماد سے روایت ہے جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا دو رکعت نماز بغرض تعلیم مروی ہے کہ امام قبلہ رخ کھڑے ہوگئے اور آپ نے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔

4۔ فروع کافی جلد 1 صفحہ 198 پر مذکور ہے کہ امام باقر علیہ السلام نماز کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نماز پڑھتے وقت ہاتھوں کو چھوڑ دو اور ان کو زانوؤں کے بالمقابل رانوں پر رکھو اور انگلیاں ایک دوسرے کے اندر نہ پھنساؤ۔ کذافی تہذیب الاحکام جلد 1' صفحہ 157 و کذافی دعاء الاسلام من علی علیہ السلام۔

آخر میں ارباب انصاف کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ شیعہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ نماز کے ہاتھ کھول کر یا ہاتھ باندھ کر پڑھنے کے متعلق ہے۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ نماز کس چیز کا نام ہے۔؟ آیا صرف قیام کا یا رکوع و سجود اور قعدہ و قعود بھی اس میں شامل ہیں؟ اور اگر یہ سب امور حقیقت نماز میں شیعہ اور سنی عقائد کے مطابق داخل ہیں اور ان میں اختلاف نہیں تو پھر ضیاء الرحمٰن فاورقی جو خود غیر مقلد ہے۔۔۔۔ صرف شیعہ خیر البریہ کو مطعون کرنے کا کیا حق رکھتا ہے؟ امام مالک کے مقلدوں کو کیوں

کچھ نہیں کہتے۔ فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ ۔ "یک من علم را دہ من عقل باید" اگرچہ ہماری اسلامی برادری میں فی الجملہ علم موجود ہے مگر جس چیز کا ان کے ہاں قحط ہے وہ جو ہر عقل ہے اور اگر ہے تو پھر اس سے کام نہیں لیا جاتا۔ ورنہ فاروقی صاحب ایسے بودے اعتراض کرکے اپنی رسوائی کا سامان فراہم نہ کرتے۔ (سورہ 7 آیت 29)

مذہب جعفریہ کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ ان کے تمام دینی و مذہبی مسائل کی بنیاد قرآن حکیم اور حدیث نبوی ؐ کے اوامر و نواہی کے عین مطابق ہے۔ شیعوں کے نزدیک قرآن کی تفسیر و تاویل کا حق صرف آئمہ اہل بیت ؑ کو حاصل ہے' جب کہ اہل سنت اس سلسلے میں یا تو صحابہ کرام پر اعتماد کرتے ہیں یا آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک پر۔

قدرتی طور پر اس صورتحال کی وجہ سے احکام اور بالخصوص فقہی احکام میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ خود اہل سنت کے چاروں مذاہب میں آپس میں کافی اختلاف ہے۔ یہ تو کوئی حیرت کی بات نہیں کہ شیعوں اور سینوں میں اور زیادہ اختلاف ہو۔ دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ اعتراض کرنے سے پہلے فاروقی صاحب

علماء علام کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ مذہب جعفریہ کی تمام نمازیں قرآنی آیات اور احادیث کے عین مطابق ہیں۔ مثلاً نماز یومیہ (پنجگانہ نماز) پڑھنے کا حکم قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود ہے۔ اختصار کو مد نظر رکھ کر چند آیات ملاحظہ ہوں۔

1۔ پارہ اول' سورۃ البقرہ آیت 43 حکم باری تعالیٰ ہے۔

"وَاَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوْ الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ" نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو اور خصوصاً اجتماعی عبادت کو فراموش نہ کرتے ہوئے) رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

آخری حکم اگرچہ باجماعت نماز کے بارے میں ہے۔ لیکن نماز کے تمام افعال سے صرف رکوع کو بیان کرتے ہوئے کہنا کہ رکوع کرو ۔۔۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ شاید اس بنا پر کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع بالکل نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی نماز ہے جس کے بنیادی ارکان میں رکوع شامل ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ نماز پڑھو' بلکہ فرمایا' اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) یعنی فقط یہی نہ ہو کہ تم نماز پڑھتے رہو بلکہ ایسا کرو کہ آئین نماز معاشرے میں قائم ہو جائے اور لوگ عشق و وارفتگی

کے ساتھ اس کی طرف جائیں۔

2۔ پارہ اول' سورۃ البقرہ آیت 83 میں ارشاد ربانی ہے کہ "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسَ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوْا الزَّکٰوۃَ" اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کرو نیز نماز قائم کرو' اور زکوٰۃ ادا کرو۔"

3۔ پارہ 7 سورہ الانعام آیت 9 میں حکم ہے کہ وَ اَنْ اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَ بَشِرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اور پابندی سے نماز پڑھو اور مومنین کو نجات کی خوش خبری دو"

نماز جمعہ

(پارہ 28 سورۃ الجمعہ آیت 9) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَ ذَرُوْا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اے ایمان والو! جب تم کو جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لیے پکارا جائے تو تم خدا کی یاد کی طرف دوڑ پڑو اور لین دین چھوڑ دو اگر علم رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔

نماز جنازہ

(پارہ 10 سورہ توبہ آیت 84) "وَلاَ تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلاَ تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ - اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَمَا تُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ" "اور اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ان میں سے کوئی مرجائے تو تم کبھی

اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ نافرمانی کی حالت میں مرگئے۔"

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی میت کے جنازہ میں نماز پڑھتے تو ایک ساعت اس کی قبر پر ٹھہرے رہتے تھے اور اس کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے' بعد میں خداوند عالم منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے' ان کی قبر پر کھڑے ہونے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کی ممانعت فرمادی۔

نماز قصر

"واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلو ۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفرو۔ ان الکفرین کانو لکم عدوا مبینا۔

اور جب تم زمین میں سفر کرتے ہو یا تم کو خوف ہو کہ کافر تم سے فساد کر بیٹھیں گے تو ہم پر کچھ الزام نہیں کہ تم نماز میں قصر و کرو بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

سماعت قرآن

"واذا قری القران فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون"

اور جس وقت قرآن پڑھا جائے' تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

نماز تہجد

(پارہ 15 بنی اسرائیل آیت 79) ومن الیل فتهجد به نافلة لک اور اے رسول ؐ ! رات کے ایک حصہ میں تہجد پڑھا کرو۔ نماز تہجد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر واجب تھی۔ لیکن امت اسلامیہ کے لیے سنت ہے۔

نماز عیدین

(پارہ 30 الاعلی) قد افلح من تزکی اس نے یقیناً فلاح پائی جو پاک رہا اور اپنے پروردگار کو یاد کرتا رہا۔

یقیناً وہ شخص فلاح پائے گا جو اپنا تزکیہ کرے گا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرے گا۔ اور اس کے بعد نماز پڑھے وذکر اسم ربه فصلی اس طرح فلاح و رستگاری اور کامیابی و نجات کے عوامل ان تین چیزوں کو بتایا ہے تزکیہ 'نام خدا کا ذکر' اور اس کے بعد نماز پڑھنا۔

دوسری بات یہ کے تزکیہ سے مراد دل کو اخلاقی رذائل سے پاک کرنا ہے' اور اعمال صالح بجالانا ہے۔ قرآن مجید میں آیات فلاح کے نقطہ نظر سے دوسری آیات کے علاوہ سورہ مومن کے آغاز کی آیتیں ہیں' جو فلاح کو اعمال صالح کی روح قرار دیتی ہیں اور سورۂ شمس آیت 9 کے حوالے سے

جس میں تقویٰ اور فجور کے بیان کے بعد فرمایا گیا ہے قد افلح من زکھا وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو فجور و فسق اور دوسرے برے اعمال سے پاک کیا اور تقویٰ سے آراستہ کیا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ تقویٰ سے مراد زکوٰۃ فطرہ دینا ہے۔ عید فطر کے دن پہلے زکوٰۃ فطر ادا کی جائے پھر نماز عید پڑھی جائے جیسا کہ متعدد روایات میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔ (نور الثقلین جلد 5 ص 556 حدیث 19 تا 21 اور یہی معانی منابع اہل سنت میں حضرت علیؑ سے منقول ہیں (روح المعانی جلد 30 ص 110 اور تفسیر کشاف جلد 4 ص 740)

حی علی خیر العمل

اہل تشیع اپنے آئمہ معصومین ؑ کی پیروی میں حَیِّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلْ کو اذان و اقامت کا جز شمار کرتے ہیں اور اس کے بغیر اذان و اقامت کو باطل سمجھتے ہیں۔ جہاں تک شیعہ مسلک کا تعلق ہے تو اس کے نزدیک حَی عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلْ اذان و اقامت کا جز ہونے پر علمائے امامیہ کا اجماع و اتحاد ہے۔

جبکہ سنن بہقی جلد ا ص ۴۲۵ اور البحر الرائق ص ۲۷۵ کے مطابق علمائے اہل سنت میں سے بعض کہتے ہیں کہ حَیّ عَلٰی خَیْر الْعَمَلْ اذان و اقامت کا جزو نہیں ہے اور اسے نہیں کہنا چاہیے۔ مختصراً عرض ہے۔ کہ بعض علمائے اہل سنت اس جملہ کو حرام اور بعض مکروہ سمجھتے ہیں۔

ہم علمائے امامیہ کا مسلک اوپر پیش کر چکے ہیں۔ اس جگہ مناسب ہو گا کہ مسلک اہل سنت کے نقطہ نظر سے اس جملہ کے جواز یا عدم جواز کا جائزہ لیتے چلیں۔ جہاں تکَ حَی عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلْ کی تشریع اور اسلامی حکم

ہونے کا تعلق ہے۔ خوش قسمتی سے متقدمین و متاخرین علمائے اہل سنت اس نظریہ میں امامیہ مسلک سے. متفق ہیں کیونکہ اہل سنت کی معتبر کتب میں اس جملہ کا وجود اذان و اقامت ہر دو میں ملتا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ شیعوں نے اس جملہ کو اذان و اقامت میں کہنا چھوڑا نہیں اور اہل سنت نے حضرت عمر کے ایک فرمان کا سہارا لے کر اسے ترک کر دیا ہے۔

دسیوں علمائے اہل سنت نے اپنی کتب حدیث تاریخ اور عقائد میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ۔

"ایک دن حضرت عمر اپنے دورِ اقتدار میں منبر پر تشریف فرما تھے اور فرمایا تین چیزیں زمانہ رسالت ماب میں حلال تھیں آج میں ان سے تمہیں منع کرتا ہوں۔ انہیں حرام قرار دیتا ہوں اور جس نے بھی یہ تین کام کئے اسے سزا دوں گا وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ "متعہ غیر دائمی شادی)، حج تمتع اور حی علی خیر العمل"

اطمینان خاطر کے لیے ملاحظہ فرمایئے۔ شرح تجرید از علامہ قوشجی ص ۴۸۴ اور کنز العرفان جلد ا ص ۱۵۸۔ اگر حضرت عمر کے اس فرمان کا تجزیہ کیا جائے تو ہر عقلمند اور باشعور کو دو باتیں نظر آئیں گی۔

(ا) حضرت عمر کی بحیثیت ایک محدث کے روایت حدیث

(۲) حضرت عمر کا فتویٰ۔

روایت حدیث یوں ہے کہ حضرت عمر نے پہلے یہ فرمایا ہے کہ یہ تینوں چیزیں زمانہ سرکار رسالت میں تھیں۔ حضرت عمر کی یہ روایت بیان کر دینے کے بعد اس بات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ روایت درست ہے جو اگرچہ الفاظ حضرت عمر ہی کے ہیں لیکن بالمعنی روایت کے ذیل میں آتی ہے اور اس روایت میں کسی قسم کے کیڑے نہیں نکالے جاسکتے جسے ہم تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ حضرت عمر نے سچ فرمایا ہے۔

فتویٰ "میں اسے حرام قرار دیتا ہوں۔" قابل توجہ ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں حضرت عمر کے اس فتویٰ کا جو جواز پیش کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

"حضرت عمر ایک فقیہ تھے۔ اور فقیہ کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کا حق ہوتا ہے خواہ اس کا اجتہاد کسی دوسرے کے اجتہاد سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔"

اہل سنت سے اہل تشیع کا اختلاف اسی مسئلہ پر ہے اور حضرت عمر کے فقیہ ہونے میں قطعی کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اختلاف آنحضورؐ کی حیثیت میں ہے جو علامہ قوشجی نے پیش کی ہے اور وہ آنحضورؐ کا فقیہ ہوتا۔

اسلامی مسلمہ اصولوں کے مطابق آنحضورؐ کی حیثیت فقیہ کی نہیں بلکہ شارع کی ہے اور شارع اور فقیہ میں از روئے علم معقول نسبت عام خاص مطلق کی ہے۔ یعنی ہر شارع فقیہ ہوتا ہے جبکہ ہر فقیہ شارع نہیں ہو سکتا۔

ہر فقیہ کے اجتہاد کی بنیاد شارع کا قول ہوتا ہے کوئی فقیہ اپنے اجتہاد کی بنیاد شارع کے نظریہ سے تصادم پر نہیں رکھ سکتا شارع کے قول کو اصطلاحاً نص اور فقیہ کے اجتہاد کو فتویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلامی مسلمات کے مطابق اگر کسی مقام پر نص اور فتویٰ میں تصادم ہو جائے تو نص پر عمل واجب ہوتا ہے اور فتویٰ کو رد کر دینا واجب ہوتا ہے۔

اسی مسلمہ اسلامی کلیہ کے پیش نظر شیعہ حضرت عمر کی مندرجہ بالا روایت کو تسلیم کرتے ہیں جو ایک نص اور قول شارع ہے اور حضرت عمر کے فتویٰ کو قبول نہیں کرتے جو شارع کے قول کے خلاف ہے۔

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ

ضَلَّ ضَلٰلاً مُبِیْنًا"

(ترجمہ جب اللہ اور رسول ؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر اس بات میں کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کا کوئی اختیار نہیں۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی نافرمانی کی وہ بالکل گمراہ ہو گیا۔" (سورہ الاحزاب)

قرآن میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں)

اسی طرح اس بارے میں احادیث بھی بہت ہیں یہاں اختصار کے سبب ایک حدیث نبوی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جس چیز کو محمد ؐ نے حلال قرار دیا وہ قیامت تک کے لیے حلال ہے اور جس چیز کو محمد ؐ نے حرام کیا وہ قیامت تک حرام ہے۔"

اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ایسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں فیصلہ کرے جس کے متعلق اللہ یا اس کے رسول ؐ کا حکم موجود ہو۔

الایضاح ص ۲۰۲ کے مطابق امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف اور دیگر علمائے اہل سنت نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سرور انبیاء۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے کچھ زمانہ تک اذان و اقامت

میں حی علی خیر العمل کہا جاتا رہا ہے لیکن بعد میں حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ حی علی خیر العمل کا جملہ مسلسل سن سن کر امت مسلمہ کہیں نماز ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لے اور جہاد سے روگردانی نہ کرنے لگے اس لیے حی علی خیر العمل کو اذان و اقامت سے ساقط کر دیا جائے۔

علامہ تفتازانی نے شرح عصد میں لکھا ہے کہ حی علی خیر العمل زمانہ رسالت میں ثابت ہے لیکن حضرت عمر نے اسے حذف کر دینے کا حکم دیا کیونکہ آپ کو ڈر تھا کہ لوگ کہیں نماز کی خاطر جہاد کو چھوڑ دیں۔

کنز العمال جلد ۸ ص ۳۴۳ کے مطابق آنحضورؐ کا مقرر کردہ مئوذن بلال حی علی خیر العمل اذان میں کہتا تھا۔

سورہ السجود ص ۱۰۰ میں علامہ عبد الرزاق نے حدیث معراج کے ذیل میں لکھا ہے کہ جبرائیل نے آسمانوں میں اذان کہی اس میں حی علی خیر العمل بھی دو مرتبہ کہا! الانتصار ص ۲۹ پر سید مرتضٰی نے لکھا ہے کہ اکثر علمائے اہل سنت اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ زمانہ رسالت ماب میں حی علی خیر العمل جزو اذان تھا جبکہ بعض علمائے اہل سنت نے یہ بے بنیاد دعویٰ کیا ہے کہ پہلے یہ جملہ جزو اذان نہ تھا۔

لیکن بعد میں منسوخ ہو گیا مگر بایں ہمہ بعض علمائے اہل سنت

کے مطابق حضرت عمر کے اس حکم کے باوجود اصحاب اور تابعین نے حی علی خیر العمل کو اذان و اقامت میں کہنا ترک نہیں کیا تھا ان اصحاب میں حضرت عمر کے فرزند عبداللہ بھی شامل تھے۔ ملاحظہ ہو سنن بیہقی جلد ا ص ۶۲۴ مبادی الفقہ الاسلامی عرفی ص ۳۸ اور المصنف نمبر ۴۶۰ ص ۴۶۴

سنن بہیقی جلد ا ص ۴۲۵ کے مطابق سہل ابن حنیف اذان و اقامت میں حی علی خیر العمل کہتا تھا منشور المناضرات جلد ۲ ص ۱۳۳ میں تلتوفی نے ابوالفرج سے روایت کی ہے میرے زمانہ تک اذان و اقامت میں حی علی خیر العمل کہا جاتا تھا۔

البدایہ والنہایہ جلد ۱۲ ص ۳۸۹ اور تاریخ دمشق ص ۳۴۹ کے مطابق جب صلاح الدین ایوبی نے مصر فتح کر کے شام کا رخ کیا اور حلب کے باہر خیمہ زن ہوا' تو عرب کے گورنر نے (تاب مقاورت) نے دیکھ کر اہالیان حلب کو جمع کیا' اور انہیں صلاح الدین سے جنگ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اہالیان نے چند شرائط پیش کیں ان میں سے ایک شرط اذان و اقامت میں حی علی خیر العمل کہا بھی تھا جسے حلب کے گورنر نے قبول کیا۔

سنن بیہقی جلد ا ص ۴۲۵ اور مبادی فقہ اسلامی ص ۳۸ کے

مطابق امام زین العابدین سے مروی ہے کہ آپ نے اذان و اقامت میں حی علی خیر العمل پڑھا پھر فرمایا کہ صدر اسلام کی اذان یہ ہے۔

سیرت حلبیہ جلد ۲ ص ۱۰۵ کے مطابق جب البویہ کی حکومت تھی تو اذان و اقامت میں حی علی خیر العمل کہا جاتا تھا' پھر جب آل سلجوق بر سر اقتدار آئے تو انہوں نے اذان و اقامت سے حی علی خیر العمل نکال کر اذان صبح میں الصلوۃ خیر من النوم کہلوانا شروع کر دیا۔

اذان میں تثویب

صبح کی اذان میں الصلوۃ خیر من النوم کہنے کو اصطلاحا تثویب کہا جاتا ہے جہاں تک شیعہ مسلک کا تعلق ہے ان میں تثویب نہ کہنے پر اجماع ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے تثویب کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ہم اسے نہیں پہچانتے۔

وجہ تسمیہ

یعنی اذان صبح میں الصلوۃ خیر من النوم کو تثویب کیوں کہا جاتا ہے؟ فتح الباری جلد ۲ ص ۸۵ کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ موذن حی علی الصلوۃ کہنے کے بعد فورا لوگوں کو الصلٰوۃ خیر من النوم کہہ کر کہ اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے "کہ نماز نیند سے بہتر ہے" بالفاظ دیگر اسی سابق جملہ حی علی الصلٰوۃ کو دوبار الصلٰوۃ خیر من النوم کے الفاظ میں ادا کرتا

ہے۔

ممکن ہے شویب کے اور معانی بھی کئے جاتے ہوں لیکن جب اذان میں شویب کہا جائے گا تو اس سے مراد صرف اذان میں الصلٰوۃ خیر من النوم کہنا ہی مقصود ہوگا مقام شویب شیعہ مسلک کے مطابق شویب کی عدم مشروعیت پر اجماع ہے۔ جہان تک اہل سنت کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے ترمذی جلد ا ص ۳۸۱ کے مطابق امام شافعی کے نزدیک شویب بدعت اور غیر مشروع ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خود حضرت عمر بھی اس جملہ کو بدعت فرماتے تھے (حدائق جلد ۷ ص ۴۱۸)

کنز العمال جلد ۸ ص ۳۵۷ حدیث نمبر ۲۳۲۵۲ میں مجاہد کہتا ہے کہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر کے ساتھ ایک مسجد میں گیا تاکہ نماز پڑھیں موذن اذان کہہ رہا تھا جب موذن نے شویب یعنی "الصلٰوۃ خیر من النوم تو عبداللہ نے مسجد سے باہر نکل کر مجھ سے کہا "مجاہد جلدی باہر نکل آ کہ اس بدعتی سے دور ہو جائیں عبداللہ نے اس مسجد میں نماز نہیں پڑھی۔

سنن ترمذی جلد ا ص ۳۸۲ کے مطابق سب سے پہلے جس شخص نے اذان میں یہ جملہ رائج کیا اس کا نام سعد قرظ تھا۔ خلیفہ حضرت عمر نے سعد پر اعتراض کیا اور اس جملہ کو بدعت سے تعبیر کیا۔

سنن دار قطبی جلد ا ص ۲۳۶ میں سعد قرظ جو اس جملہ کا موجد ہے اذان بلال کی روایت کرتا ہے جس میں یہ جملہ نہیں ہے۔

(حضرت عمر کا موذن حضرت عمر کو وقت نماز سے مطلع کرتا موطا مالک ص ۵۵ اور کنز العمال میں ذکر ہے' کہ ایک دن حضرت عمر نیند میں تھے چنانچہ اس نے آپ کو جگانے کی خاطر باآواز بلند کہا "الصلٰو ۃ خیر من النوم" آپ نیند سے بیدار ہوگئے اور فرمایا یہ بڑا اچھا جملہ ہے اسے روزانہ کی اذان صبح میں داخل کر دو کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ بلال اذان میں حی علی خیر العمل کہتا تھا آنحضورؐ نے اسے منع فرمایا اور حکم دیا کہ الصلوۃ خیر من النوم کہہ کر کہ اس روایت کی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ مجمع الفوائد جلد ا ص ۲۳۰ سنن بیہقی جلد ا ص ۴۲۵ اور المصنف عبدالرزاق جلد ' ص ۴۶۰ کے مطابق بیسیوں روایات میں یہ بات موجود ہے کہ رسالت کے زمانے میں الصلواۃ خیر من النوم کا وجود نہیں تھا یہ جملہ حضرت عمر کے دور خلافت میں اذان صحیح میں کہنا شروع ہوا۔

شہادت ثالثہ

اذان و اقامت میں اشہد ان علیا ولی اللہ کہنے کا نام شہادت ثالثہ ہے اگر موذن شہادت رسالت کے بعد اشہد ان علیا ولی اللہ کہے تو گویا اس نے شہادت ثالثہ کہی ہے۔

اس وقت کرہ ارض پر کوئی ایسی شیعہ آبادی نہیں ہے جس میں شہادت ثالثہ اذان و اقامت میں نہ کہی جاتی ہو اور یہی شہادت علامت شیعہ میں سے ایک اہم ترین علامت ہے' یعنی اس کا اذان و اقامت میں ہونا تو غیر مشکوک اور مختلف فیہ ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ شہادت ثالثہ اذان و اقامت میں رواج پذیر کب ہوئی؟

کیا شیعوں نے اس جملہ کو خوش اعتقادی اور محبت علیؑ کی وجہ سے از خود شامل اذان کیا ہے؟ یا آنحضورؐ کے زمانہ میں یہ کلمہ حی علی خیرالعمل کی طرح شامل اذان و اقامت تھا جسے بعد میں اذان سے دور کر دیا گیا؟

اس سوال کا جواب اگر از راہ تحقیق و دریافت تلاش کیا جائے تو یہ حقیقت مخفی نہ رہے گی کہ یہ کلمہ الصلوۃ خیر من النوم کی طرح شیعوں کی ایجاد نہیں ہے' بلکہ آنحضورؐ کے زمانے سے رواج پذیر ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم تھا اور بعض صحابہ اسے اذان و اقامت کہتے تھے جنہیں نبی اکرمؐ اچھی طرح جانتے تھے اور آپ اس سے بخوبی واقف و آشنا تھے۔ اہل سنت کا ایک عالم فرماتے ہیں۔

شیخ عبداللہ مراغی علماء مصر کے دانش مند اور منصف مزاج تھے' اپنی مایہ ناز تصنیف لسلافہ فی امر الخلافہ میں رقمطراز ہیں بحوالہ جواہر الولایتہ ص ۳۷۶ اور شہادت ثالثہ ص ۳۴) سلمان فارسیؓ اذان و اقامت میں کلمہ

رسالت کے بعد شہادت ثالثہ کہتا تھا ایک مرتبہ ایک صحابی سے سن لیا، فورا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی، حضورؐ میں نے سلمان فارسی کو اذان و اقامت میں اشہد ان محمد رسول اللہ کے بعد اشہد ان علیا ولی اللہ کہتے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا تو نے سلمانؓ سے کلمہ خیر و عبادت سنا ہے۔

اسی کتاب میں علامہ عبداللہ مراغی ایک اور مقام پر رقمطراز ہیں کہ نبی کریمؐ کے ایک صحابی نے آنحضورؐ کی خدمت میں عرض کیا حضورؐ! میں نے ابوذرؓ سے اذان و اقامت میں رسالت کی شہادت کے بعد ولایت علیؑ کی شہادت کا کلمہ سنا ہے۔

آپؐ نے اس صحابی کو فرمایا۔ کیا تو نے غدیر خم پر میرا یہ اعلان سنا تھا من کنت مولاہ فھذا علی مولا؟

اس نے عرض کیا حضورؐ سنا تھا۔ آپ نے فرمایا، جس نے بھی اس عہد کو توڑا۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

اگرچہ عصر حاضر کے فقہاء میں یہ معروف ہے کہ شہادت ثالثہ جزو اذان نہیں ہے لیکن تبرکا اور قصد ثواب کہنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے لیکن کچھ معاصرین فقہاء نے اسے جزو اذان بھی قرار دیا ہے۔ چند ایک کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمائیے۔

۱ آیت اللہ عبدالنبی عراقی نے اپنی فقہ استدلالی بحث میں دس دلائل اس بات کے دیئے ہیں کہ دیگر فصول اذان کی طرح شہادت ثالثہ بھی جزوا اذان ہے۔

آپ کے یہ درس آپ کے ایک شاگرد نے جمع کر کے شائع کئے ہیں جو البدایہ فی کوفی الشہادہ بالولایہ فی الاذان والاقامۃ جزا کساترا الاجزا۔

۲ آیتہ اللہ مرزا آقا اصطہباناتی نے اپنے رسالہ شرح رسالتہ الحقوق جلد ۲ ص ۱۰۳ میں اذان و اقامت میں شہادت ثالثہ کو جز قرار دیا ہے۔

بعض فقہاء نے قطعی اور حتمی طور پر شہادت ثالثہ کے جزو اذان ہونے کا اعلان تو نہیں فرمایا البتہ جزو اذان ہونے کا احتمال پیش کیا ہے چند ایک ایسے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں=

(۱) علامہ مجلسی نے بحار الانوار جلد ۸۴ ص ۱۱۱ پر فرمایا= بعید نہیں ہے کہ شہادت ثالثہ اذان و اقامت کے اجزائے مستحبہ سے ہو' کیونکہ شیخ طوسی' علامہ حلی اور شہید اول نے تصریح کی ہے کہ اس سلسلہ میں آئمہ معصوم علیہم السلام سے منقولہ روایات موجود ہیں۔

(۲) آیت اللہ کاشف الغطا نے عروۃ الوثقی کے حاشیہ پر لکھا ہے۔

ادلہ عمومیہ کی بنا پر شہادت ثالثہ کا اذان و اقامت میں جزو مستحب

ہونے پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

(۳) صاحب جواہر نے جواہر الکلام جلد ۹ ص ۸۷ میں شہادت ثالثہ کے جزو اذان و اقامت پر اظہار میلان فرمایا ہے لیکن صرف اس بنا پر کہ چونکہ علمائے سلف نے شہادت ثالثہ کے جزو ہونے کا فتویٰ نہیں دیا اس لیے میں نے فتویٰ نہیں دیا۔

۵ آیۃ اللہ حکیم نے متمسک جلد ۵ ص ۵۴۵ میں شہادت ثالثہ کو شعائر شیعہ سے شمار کرتے ہوئے فرمایا ہے' کہ اس کا کہنا واجب ہے۔ اسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بحار میں علامہ مجلسی نے شہادت ثالثہ کو کیوں جزو مستحب قرار دیا ہے؟ کیونکہ شیخ طوسی' علامہ حلی اور شہید اول وغیرہ نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس سلسلے میں روایات موجود ہیں اور حدیث احتجاج ان کی مئوید ہے۔

خیر الامور قلمی نسخہ میں آیۃ اللہ سید احمد زنجانی رقمطراز ہیں کہ شہادت ثالثہ کا تذکرہ حضرت علیؑ کی عظمت و شان اور خاندان ولایت مطلقہ سے اظہار ربط و محبت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ شہادت ثالثہ خواہ اذان و اقامت ہو یا مستحب ہو یا .مقصد ثواب کہی جائے کوئی بدنصیب یہ تو نہیں کہتا کہ سرے سے اسے اذان و اقامت میں کہا ہی نہ جائے جب کہنا ہے تو

کس طرح کہا جائے اور الفاظ کیا ہوں۔؟

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو ان میں دو طرح سے

شہادت ثالثہ مروی ہے۔

(۱) اشہد ان علیا ولی اللہ۔

(۲) اشہدان علیا امیرالمومنین۔

ان دو میں سے جو کہی جائے عمومی معصومینؑ کی اطاعت ہو جاتی ہے

اور شہادت ایمانی کا اعلان و اظہار بھی ہو جاتا ہے۔

بعض فقہاء نے ان ہر دو منقول کلمات کو جمع کرکے فرمایا ہے کہ

اس طرح کہا جائے اشہدان علیا امیر المومنین ولی اللہ۔

پاؤں کا مسح

ضیاء الرحمٰن فاروقی کا شیعوں پر ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ شیعہ عقل و نقل کے خلاف پاؤں دھونے کی بجائے مسح کی فرضیت کے قائل ہیں حالانکہ باقی ہر مذہب کے مسلمان وضو میں پاؤں دھونا فرض سمجھتے ہیں۔ بہرحال فاروقی صاحب نے اس سلسلے میں کچھ اشتہار زیر بحث میں تحریر کیا ہے وہ خلاف واقع ہے۔ اور خداوند کریم کے فضل سے شیعان حیدر کرارؑ کا عمل و کردار قرآن کریم و سنت نبویؐ اور طریقہ عترت اطہارؑ کے عین مطابق ہے۔

مذکورہ بالا اجمال کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح کرنے یا ان کے دھونے کا شیعہ و سنی اختلاف آیت وضو (پارہ ۵ سورہ مائدہ آیت ٦)

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى

الْکَعَبِیْن

"اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو ڈالو۔ اور سر اور پاؤں کا مفصل یا ابھری ہوئی جگہ تک مسح کر لو۔"

اس آیت میں وارد شدہ لفظ ارجلکم کی قرات کے اختلاف پر مبنی ہے۔ قراء سبعہ میں سے چار قراء۔ ابن کثیر' ابو عمرو' حمزہ اور عاصم نے ارجلکم کی لام پر زبر پڑھی ہے۔ اور باقی تین قاریوں نے اس پر زیر پڑھی ہے (تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی جلد 3 صفحہ 545 طبع مصر) اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں قرآتیں مشہور ہیں۔ تفسیر کبیر جلد 3 صفحہ 545 منہاج السنتہ جلد 2 صفحہ 156 بلکہ متواتر ہیں (تحفہ اثنا عشریہ صفحہ طبع لکھنؤ)

اگرچہ اہل بیتؑ کے فرمان سے زیر والی قرآت کی تائید مزید ہوتی ہے (ملاحظہ ہو قرات حسنین شریفین علیہما السلام جامع البیان ابن جریر جلد ۱' صفحہ 55 طبع مصر قرات امام محمد باقر تفسیر نیشاپوری برحاشیہ تفسیر ابن جریر ج ٦ صفحہ 74 و تفسیر جامع البیان ابن جریر جلد ٦ صفحہ 74'73)

یہ حقیقت اربابِ بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے کہ آئمہ اہل

بیت علیہم السلام کے قول و فعل میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ "قول واحد منھم قول باقیھم" یعنی ان میں سے جو ایک قول ہے وہی سب کا قول ہے۔ (دراسات اللیب صفحہ 35 طبع لاہور) اس کی وجہ یہ ہے کہ سب کا ماخذ احکام بھی ایک ہے (قرآن و سنت) اور سب کا علم و فضل اور فہم و ادراک بھی ایک صغارھم و کبارھم فی الفضل سواء (جلد 7 بحار الانوار) بنا برایں سب آئمہ اطہارؑ کی قرات یہی سمجھی جائے گی۔ بہر کیف کہا یہ جاتا ہے کہ اگر "ارجلکم" کی لام پر زبر پڑھا جائے تو اس سے دھونا ثابت ہوتا ہے اور اگر اس پر زیر پڑھی جائے تو اس سے مسح ثابت ہوتا ہے۔ (تفسیر جامع البیان نواب صدیق حسن خان صفحہ 95 تفسیر وحیدی پ ٦ صفحہ 242 حاشیہ نمبر 5 طبع لاہور)

شیعہ کہتے ہیں کہ "ارجلکم کو خواہ لام کی زبر سے' پڑھا جائے اور خواہ لام کی زیر سے بہرحال اس سے پاؤں کا مسح ثابت ہوتا ہے' نہ کہ دھونا۔ اس ابہام کی بقدر توضیح یہ ہے کہ اگر اس پر زیر پڑھی جائے تب تو باتفاق فریقین اس سے پاؤں کا مسح ہی ثابت ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد 3 صفحہ 441' تفسیر نیشاپوری برحاشہ ابن جریر جلد 6 صفحہ 67 وغیرہ)

جرجوا والا قول باطل ہے کیونکہ اس صورت میں "ارجلکم" کا

عطف "برؤسکم" کے لفظ پر جو کہ لفظ "فامسحوا" کے تحت واقع ہے۔ بہرحال یہ ایک نحوی بحث ہے جو بہت طویل ہے۔ اختصار کو مد نظر رکھ کر نحوی بحث میں الجھنا مناسب نہیں' البتہ اس موضوع کے بارے میں ایک دو سادہ مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

مثلاً یہ کہ ایک شخص نے زید و بکر کو سلام کیا' اور خالد و عمرو کے پاس سے گزرا' لیکن یہ درست نہیں ہے کہ وہ شخص جس نے زید و بکر کو سلام کیا اور خالد کے پاس سے گزرا اور عمرو کا۔ بعینہ یہی صورتحال آیت زیر بحث میں ہے۔ یہاں دو متضاد حکم ہیں ایک فاغسلوا (منہ ہاتھ دھونے کا) دوسرا فامسحوا (سر اور پاؤں کے مسح کرنے کا) دو چیزیں فاغسلوا کے تحت داخل ہیں (منہ اور ہاتھ) اور دو چیزیں فامسحوا کے تحت (سر اور پاؤں) اب پاؤں کو کھینچ تان کر فاغسلوا کا محمول بنا کر اس کے تحت درج کرنا اسی طرح قانون فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے' جس طرح مذکورہ بالا مثالوں میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہوگیا کہ "ارجلکم" کی لام پر زیر پڑھی جائے اور خواہ زبر بہر صورت پاؤں کا مسح کرنا ثابت ہے۔

فاروقی صاحب بغیر کسی دلیل کے شیعوں کے خلاف کفر کا فتویٰ مت لگاؤ۔ آیئے ہم مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کی کتابوں سے حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت عظام ' صحابہ کرام اور تابعین بااحسان کا پاوں پر مسح کرنا ثابت کرتے ہیں=

(1) عباد بن تمیم اپنے والد تمیم سے روایت کرتے ہیں "رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ تَوَضَّا وَ مَسَّحَ بِالْمَاءِ عَلٰی لِحَیْتِہٖ وَ رِجْلَیْہِ" یعنی میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا' انہوں نے پانی سے داڑھی اور دونوں پاؤں کا مسح کیا۔ (یعنی ہاتھ کا پانی خشک ہونے کی صورت میں ریش مبارک پر ہاتھ پھیر کر تری حاصل کی) کنز العمال جلد 5 صفحہ 102 بحوالہ ابن ابی شیبہ ' احمد بخاری تاریخ' عدنی ' بغوی ' باوری ' طبرانی اور ابو نعیم ' قَالَ فِیْ الْاَصَابَۃِ رِجَالَہٗ ثِقَاتَ

(2) "اِنَّ النَّبِی تَوَضَّأَ فَغَسَّلَ وَجْھَہٗ وَ یَدَیْہِ مَرَّتَیْنِ وَ مَسَّحَ رَأسَہٗ وَ رِجْلَیْہِ مَرَّتَیْنِ یعنی جناب رسول ؐ خدا نے اس طرح وضو کیا اور ہاتھ کو دو مرتبہ دھویا اور سر اور پاؤں کا دو بار مسح کیا۔ کنز العمال جلد 5 صفحہ 108 بحوالہ مسند عبداللہ بن زید مازنی۔

(3) عباد بن تمیم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہَ یَتَوَضَّأَ وَ یَمْسَحُ الْمَاءَ عَلٰی رِجْلَیْہِ میں نے جناب رسول ؐ خدا کو وضو کرتے ہوئے دیکھا انہوں نے اپنے دونوں پاؤں پر مسح کیا۔ (اصابہ فی تمیز الصحابہ جلد 1' صفحہ 185 بذی ترجمہ تمیم بن زید انصار۔)

اس کے بعد ابن حجر نے لکھا ہے رجالہ ثقات یعنی اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (کذا فی نیل الاوطار جلد 1 صفحہ 164)

جس طرح جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسح پا کرنا ثابت ہے' اسی طرح دوسروں کو اس بات کا حکم دینا بھی کتب فریقین سے ثابت ہے۔

(1) رفاء بن رافع بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تتم صلوۃ لاحد حتی یسبغ الوضو کما امر اللہ تعالی فیسغل وجھہ و یدیہ الی المرافقین و یمسح براسہ و رجلیہ الی الکعبین" یعنی کسی شخص کی نماز اس وقت تک تمام صحیح نہیں جب تک اس طرح مکمل طور پر وضو نہ کرے' جس طرح خدا نے حکم دیا ہے کہ منہ ' دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوئے اور سر اور دونوں پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرے۔ (عینی شرح بخاری جلد 1 صفحہ طبع مصر۔ کذا فی شرح مہانی الاثاء جلد 1 صفحہ 31 سنن ابی ماجہ مترجم جلد 1 صفحہ 153 و سنن نسائی جلد 1 صفحہ 279 و سنن ابی داؤد مترجم صفحہ 209 و ترمذی جلد 1 صفحہ 40 و کنز العمال ج 4 صفحہ 93 تفسیر در منثور جلد 2 صفحہ 263 بحوالہ فلک النجات فی الامامہ والصلوۃ)

(2) سنن دار قطنی جلد 1 صفحہ 35 طبع دہلی نے مذکورہ بالا حدیث کی شان ورود یوں لکھی ہے کہ رفاعہ و مالک پسران رافع بیان کرتے ہیں کہ ہم

بزم رسول ؐ میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے وہاں آکر نماز پڑھی۔ فارغ ہونے کے بعد بزم رسول ؐ میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ آنجناب ؐ نے سلام کا جواب دینے کے بعد فرمایا دوبارہ نماز پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری نماز میں کیا نقص ہے۔؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس وقت تک کسی نے حکم دیا ہے کہ منہ اور ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوئے اور سر اور پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ وضو میں پاؤں کا مسح کرنے کی بجائے ان کو دھوتے ہیں وضو غلط ہونے کی وجہ سے ان کی نماز باطل ہے۔

(3) یہی مسئلہ استبصار جلد 1 صفحہ 33۔ فروغ کافی جلد 1 صفحہ 17 میں امام جعفر صادق ؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "یاتی علی الرجال ستون و سبعون سنته ما قبل الله منه صلو ة قلت و کیف ذلک قال لانه یغسل ما امرا لله بمسحه" یعنی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے ساٹھ یا ستر برس گزر جاتے ہیں مگر اس کی نماز بھی خدا قبول نہیں کرتا۔ راوی نے عرض کیا اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا جس چیز کے مسح کا خدا نے حکم دیا ہے۔ (پاؤں) وہ اس کو دھوتا ہے۔"

جناب رسول خداؐ کی طرح حضرت علیؑ کا وضو میں پاؤں کا مسح بھی مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کی کتب سے ثابت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔ فتح الباری جلد 5 صفحہ 262 باب شرب الماء ' معانی الاثار للطحاوی جلد 1 صفحہ 21' مسند احمد بن حنبل جلد 1 صفحہ 95 ' 116 فاضل عسقلانی' نے فتح الباری جلد 1 صفحہ 133 پر یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت علیؑ پاؤں پر مسح کرتے تھے۔ بعد ازاں ابن حجر نے دعویٰ بلا دلیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعد میں انہوں نے رجوع کیا تھا یہ ایک نہایت ہی کمزور عذر ہے۔ اس اللہ کے بندے سے کوئی سوال کرتا کہ باب مدینہ علم نبویہ نے جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پورے تیس سال کرتے دیکھا اور خود اس پر اتنا عرصہ عمل پیرا رہے پھر اس سے رجوع کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ان کا پہلا عمل غلط تھا اور بعد از خرابی بسیار اپنی غلطی کا احساس ہوا؟ کیا سیرت علویہ میں اس بات کی کوئی مثال ملتی ہے؟ کیا کنز العمال جلد 5 صفحہ 108 پر ابن مطر سے روایت ہے کہ ہم حضرت علیؑ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ رسول خداؐ کا وضو بتلایئے آپ نے قنبر کو پانی لانے کا حکم دیا جب پانی آگیا تو آپ نے ہاتھ اور منہ کو دھویا پھر سر اور پاؤں کا مسح کیا۔

اسی طرح علماء اہل سنت نے یہ تسلیم کیا ہے کہ امام محمد باقر پاؤں کے مسح کو واجب جانتے تھے ملاحظہ ہو تفسیر ترجمان القرآن نواب صدیق

حسن خان صفحہ 842 تفسیر ابن کثیر ج صفحہ 299 وغیرہ۔

یہ بات بدرجہ اتم مسلم ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ میں جو ایک کا قول و فعل ہو وہی سب کا قول و فعل ہوتا ہے اور جب علماء اہل سنت نے حضرت علیؑ اور امام باقرؑ کا پاؤں پر مسح کرنا تسلیم کیا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تمام آئمہ اہل بیتؑ کا اسی پر عملدر آمد تھا جیسا کہ علامہ وحید الزمان نے انوار اللغہ پ 18 صفحہ 154' 153 پر تسلیم کرلیا ہے۔ فراجع۔

مسلمانوں کے اکثر مکاتب فکر کی کتب میں بہت سے صحابہ کرام کے نام ملتے ہیں جو بڑی سختی کے ساتھ مسحِ پا کی پابندی کرتے ہیں' اور دھونے والوں پر بھرپور تنقید کرتے تھے۔ جیسے انس بن مالک' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمرو امثالھم۔ انس کا قول ہے نزل القران بالمسح یعنی قرآن مسح کے ساتھ اترا ہے۔ (تفسیر خازن جلد 1 صفحہ 441) اور جناب عبداللہ بن عباس کہا کرتے تھے ابی الناس الا الغسل ولا اجد فی کتاب اللہ الا المسح یعنی عام لوگوں نے سوائے دھونے کے انکار کر دیا ہے اور میں قرآن میں سوائے مسح کے اور کچھ نہیں پاتا۔ (تفسیر در منثور جلد 2 صفحہ 292) ابن عباس کا یہ قول مفسرین کے نزدیک بہت مشہور ہے۔ الوضو غسلتان و مسحتان یعنی وضو دو دھونے (منہ اور ہاتھ) اور دو مسح کرنے (سر اور پاؤں) کا نام ہے (تفسیر معالم التنزیل صفحہ 270 تفسیر خازن جلد 1 صفحہ 441 وغیرہ)

اسی طرح تفسیر ترجمان القرآن صفحہ 842 پر عبداللہ بن عمر کا نام بھی ان اصحاب میں لکھا گیا ہے۔ جو پاؤں پر مسح کرنے کے قائل تھے۔ نیز تفسیر معالم التنزیل سے نقل کیا گیا ہے کہ جناب سلمان فارسی' ابوذر' عمار بن یاسر اور تمام آئمہ اہل بیتؑ وضو میں پاؤں پر مسح کرتے تھے۔

اسی طرح اہل سنت کی کتب تفاسیر و احادیث سے بہت تابعین کے نام بھی ملتے ہیں جو پاؤں پر مسح کرنے کے قائل اور شدت سے اس پر عمل کرتے تھے۔ جیسے شعبی' عامر' عکرمہ' قتادہ' جابر بن زید' علقمہ اور حسن وغیرہ۔ ترجمان القرآن صفحہ 842 ۔ تفسیر خازن جلد 1 صفحہ 441' تفسیر ابن جریر جلد 6 صفحہ 73 '64 وغیرہ۔ چنانچہ شعبی اور عامر کا یہ قول ہے انما نزل جبرئیل بالمسح علی الرجلین لا ترملی ان ما کان علیه الغسل مجل علیه التیم و ما کان علیه السمح اهمل یعنی جبرئیل تو صرف پاؤں پر مسح کا حکم لے کر اترے تھے کیا تم غور نہیں کرتے جن اعضاء کا دھونا فرض تھا انہیں پر تیمم کا حکم ہے۔ (منہ اور ہاتھ) اور جن پر مسح کا حکم تھا (سر اور پاؤں) ان کو تیمم میں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ (تفسیر خازن جلد 1 صفحہ 441 ۔ معالم التنزیل صفحہ 270 اور عکرمہ کا یہ قول تفاسیر کی کتب میں موجود ہے لیس فی الرجلین غسل انا المسح علی الرجلین' یعنی پاؤں دھونے کا حکم نہیں بلکہ ان پر مسح واجب ہے۔ (حوالہ مذکورہ بالا) قتادہ کا بیان ہے

الوضوء غسلتان و مسحتان یعنی وضو دو دھونے اور دو مسحوں کا نام ہے۔ (معالم التنزیل نمبر270)

اس بحث کے آخر میں بعض منصف مزاج علماء اہل سنت کا منصفانہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ وحیدالزمان اپنی کتاب انوار الغضہ ب 10 صفحہ 5و پ 17 صفحہ 153‘154 پر رقمطراز ہیں۔ نودی نے وضو میں پاؤں دھونے پر اجماع لکھا ہے‘ میں کہتا ہوں اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اجماع ثابت نہیں ہے بلکہ ابن قین نے بعض شافعیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ نمازی کو اختیار ہے خواہ پاؤں دھوئے‘ خواہ مسح کرے‘ اور عکرمہ کا یہ قول ہے کہ وضو میں پاؤں پر مسح کرے۔ اور حضرت علی‘ ابن عباس‘ حسن اور شعبی وغیرہ سے باسناد صحیحہ مسح منقول ہے‘ اور امامیہ نے آئمہ اہل بیتؑ سے تواتر کے ساتھ پاؤں کا مسح نقل کیا ہے اور یہ امر ایسا نہیں ہے کہ اس میں جھوٹ بنانے کا احتمال ہو اس لیے کہ یہ کسی اعتقادی امر سے متعلق نہیں ہے جو مابین شیعہ اور اہل سنت کے مختلف ہو اور شیعوں نے پاؤں کا مسح وضو میں لازم رکھا ہے اور ظاہر قرآن سے بھی مسح ثابت ہوتا ہے۔ اور ابن جریر نے متعدد روایات جواز مسح کے لیے ذکر کی ہیں۔ اگر کوئی مسح کرے تو اس کو گمراہ نہیں کہہ سکتے‘ نہ شدت کے ساتھ اس پر انکار کرسکتے ہیں کیونکہ بعض صحابہ اور تابعین سے مسح بھی منقول ہے اور ابن جریر جو بڑے مجتہد اور

محدث ہیں اسی طرح صوفیوں میں سے شیخ ابن عربی نے مسح کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ قارئین کرام کے ذوق خدا داد پر چھوڑا جاتا ہے کہ آیا شیعوں کا طرز عمل خلاف عقل و نقل ہے یا کہ نہیں۔

آیت زیر بحث میں حکم ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَ اَیْدِیْکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ" (یعنی اے ایمان والو جب تم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو"

اس آیت میں وضو میں دھونے کے لیے چہرے کی حدود کا ذکر نہیں لیکن روایات اہل بیتؑ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضو کرنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

لمبائی میں چہرے کی حد بالوں کے اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک ہے اور چوڑائی میں وہ حصہ جو درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان آجائے۔

دراصل یہ "وجہ" (چہرے) کے اس معنی کی وضاحت ہے جو عرف عام میں اس سے سمجھا جاتا ہے کیوں "وجہ" ۔ (چہرہ) وہی حصہ ہے جس کا انسان سے ملتے ہی "مواجہ" سامنا ہوتا ہے۔

ہاتھوں کی حد جو وضو میں دھوئی جانی چاہیے۔ کہنی تک بیان ہوئی ہے کیونکہ "مرافق" (مرفق) کی جمع ہے جس کا معنی ہے "کہنی" جب کہا جائے کہ ہاتھ دھولو تو ممکن ہے کہ ذہن میں آئے کہ انہیں کلائی تک دھونا ہے کیونکہ عام طور پر یہی مقدار دھوئی جاتی ہے اس پر وہم کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہنیوں تک دھوؤ (الی المرافق) اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "الی" اس آیت میں فقط دھونے کی حد بیان کرنے کے لیے ہے۔ نہ کہ کیفیت بیان کرنے کے لیے۔ جیسا بعض کو اس سے یہی گمان ہوا ہے ان کا خیال ہے کہ آیت کہتی ہے کہ ہاتھ کو انگلیوں کے سروں سے لے کر کہنی تک دھونا چاہیے (جیسا کہ اہل سنت کے ایک طبقے میں رائج ہے)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ بالکل اسی طرح ہے کہ انسان کسی کاریگر سے کہے کہ کمرے کی دیوار کو نیچے سے لے کر ایک میٹر اوپر تک رنگ کر دو تو واضح ہے کہ مقصد یہ نہیں کہ دیوار کو نیچے سے اوپر کی طرف رنگ کرو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اتنی مقدار کو رنگ کرو اس سے زیادہ یا کم نہ ہو۔ اس لیے یہاں آیت میں بھی صرف ہاتھ کی وہ مقدار مقصود ہے جسے دھونا چاہیے۔ رہی ایسی کیفیت تو وہ سنت پیغمبرؐ میں ہے جو ان کی اہل بیتؑ کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے مطابق کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سروں تک دھونا چاہیے۔ توجہ رہے کہ کہنی کو بھی وضو میں ساتھ دھونا چاہیے

کیونکہ ایسے موقع پر اصطلاح "غایت مغیا میں داخل ہے" یعنی حد بھی حکم محدود بھی شامل ہے۔

سیبویہ عربی لغت کا مشہور ماہر اور علم نحو کا عالم تھا وہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں لفظ "الی" کا مابعد اور ماقبل ایک جنس سے ہوں تو مابعد قبل کے حکم میں ہوتا ہے اور دو جنسوں سے ہو تو پھر خارج ہوتا ہے۔ (مثلاً اگر کہا جائے کہ دن کی آخری گھڑی تک روزہ رکھو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری گھڑی میں بھی روزہ رکھو اور اگر کہا جائے کہ ابتدائے رات تک روزہ رکھو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے رات حکم میں داخل نہیں ہے (المنارج جلد 2 صفحہ 223)

ابن سبا کا مفروضہ

اشتہار زیر بحث میں ضیاء الرحمٰن فاروقی نے کوئی نئی تحقیقی بات نہیں کہی حسب العادت اپنے قدیمی بزرگوں کا آموختہ دھرایا۔ قدیم الایام سے دشمنان شیعہ و شیعیت یہ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتے ہیں کہ مذہب شیعہ عبداللہ بن سبا یہودی کی ایجاد ہے۔ حالانکہ یہ سراسر کذب و افتراء ہے۔ ذیل میں بڑے اختصار کے ساتھ اس بے بنیاد پروپیگنڈے پر کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اہل تحقیق کی رائے تو یہ ہے کہ عبداللہ بن سباء ایک فرضی شخصیت اور مجنون عامری و ابوہلال کی طرح داستاں سراؤں کا خیالی ہیرو ہے۔ اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے اس سلسلہ میں شیعہ ' سنی اور انگریز محقق شامل ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر طہ حسین مصری (سنی) مورخ جارج جرداق لبنانی (عیسائی) استاد عبداللہ / سیتی کاظینی)۔ علامہ سید محمد حسین طباطبائی قمی' فاضل علامہ مرتضٰی عسکری ایرانی

(شیعہ) ڈاکٹر علی الوردی پروفیسر بغداد یونیورسٹی ' سنی) مولانا سید محمد باقر کھجوی' مولانا سید منظور حسین بخاری اجنالوی (شیعہ) ان حضرات میں سے بعض نے اپنی کتابوں کے ضمن میں اور بعض نے مستقل کتب تالیف کرکے روایت و درایت کے اصول کے تحت یہ ثابت کیا ہے کہ ابن سبا کا وجود افسانہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جسے شیعوں کو بدنام کرنے اور عثمان وغیرہ کے افعال پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑا گیا۔ یہاں بوجہ اختصار صرف ڈاکٹر طہ حسین مصری کی عبارت کے ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فاضل موصوف اپنی کتاب الفتنۃ الکبریٰ ج 1 صفحہ 132 طبع مصر میں رقم طراز ہیں "ابن سبا بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے اور جب فرقہ شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے تو اس وقت اسے جنم دیا گیا۔ شیعوں کے دشمنوں کا مقصد یہ تھا کہ شیعوں کے اصول مذہب میں یہودی عنصر شامل کر دیا جائے۔ امویوں اور عباسیوں کے دور حکومت میں شیعوں کے دشمنوں نے عبداللہ بن سبا کے معاملے میں بہت مبالغہ آمیزی سے کام لیا۔ اس کے حالات بہت بڑھا چڑھا کر بیان کئے اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ حضرت عثمان اور ان کے اعمال حکومت کی طرف جن خرابیوں کی نسبت دی جاتی ہے اور وہ ناپسندیدہ امور جو ان کے متعلق مشہور ہیں کو سن کر لوگ شک و شبہ میں پڑ جائیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ اور ان کے شیعہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و

خوار ہوں نہ معلوم شیعوں کے مخالفین نے شیعوں پر کتنے غلط الزمات لگائے اور نہ جانے شیعوں نے کتنی غلط باتیں اپنے دشمنوں کی طرف عثمان وغیرہ کے معاملہ میں منسوب کیں۔ طبری کے بعد والے تقریباً تمام مورخین نے ابن سبا کے قصہ کو طبری سے لیا ہے جیسا کہ تاریخ ابوالفداء کامل البدایہ والنہایہ وغیرہ تواریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور طبری نے اسے سیف بن عمر کی زبانی نقل کیا ہے اور سیف بن عمر علماء رجال کے نزدیک ضعیف الحدیث لیس بشئی ہے۔ متروح یضح الحدیث عامته الحدیثه منکر متهم بالوضح الزندقه میزان الاعتدال ذہبی جلد 1 صفحہ 438 تہذیب التہذیب جلد 4 صفحہ 225 وغیرہ) بہرحال جس شخص کا وجود ہی متنازعہ فیہ ہو اس کو کسی مذہب کا بانی کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ قاعدہ وقانون فطرت یہ ہے کہ ہمیشہ تمام اہل مذاہب اپنے مذہب کے بانیوں اور خدمت گاروں کا تذکرہ بڑے شاندار الفاظ اور تجلیل و تعظیم کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس شیعہ کی تمام موجودہ کتب اس بات پر شاہد ہیں کہ ابن سبا غالی اور ملعون تھا اور تمام شیعہ علمائے نے اس پر لعنت کی صراحت کی ہے اور اس کے خیالات سے بیزاری اختیار کی ہے۔ ہلکی سے ہلکی عبارت جو شیعہ علماء رجال نے اس کے بارے میں تحریر کی ہے وہ یہ ہے کہ ان عبداللہ بن سبا

لعن من لا یذکر "عبداللہ بن سبا ایسا ملعون ہے کہ اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں" (اصل شیعہ صفحہ 57)

حضرت علامہ حلی نے اپنی کتاب رجال میں حسب ذیل الفاظ میں ابن سبا کا تذکرہ کیا ہے۔ "عبداللہ بن سبا غالی ملعون ہے" امیرالمومنینؑ نے اسے زندہ آگ میں جلا دیا تھا۔ اور اس کا عقیدہ تھا کہ نعوذ باللہ علی خدا ہے اور وہ خود نبی ہے۔ خدا اس پر لعنت کرے۔ (تاریخ الشیعہ ڈاکٹر حسین علی صفحہ 9) انہی الفاظ کے ساتھ فاضل اردبیلی نے جامع الرواۃ جلد 1 صفحہ 485 اور فاضل قمی نے تحفتہ الاحباب صفحہ 184 میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور اسی مضمون کی دو روایتیں رجال کشی میں موجود ہیں۔ فراجع! ان حقائق سے معلوم ہوا کہ بنا بر تسلیم وجود نحس ابن سبا (کما ہو الحق) وہ شیعی عقائد کا حامل نہ تھا بلکہ غالی تھا۔ غلو اور تشیع باہم ضدیں ہیں جن کا ایک شخص میں اور ایک ہی وقت میں اجتماع ناممکن ہے۔ بھلا جو شخص حضرت علیؑ کو خدا یا خدا کا اوتار اور خدائی صفات کا حامل سمجھتا ہے وہ اسے حضرت رسولؐ کی مسند کا وارث اور امام کیسے سمجھ سکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اگر حضرت علی نے اسے جلایا ہے یا بروایت اس کو شہربدر کیا ہے تو اس کو اس کے غلو کی وجہ سے ایسا کیا ہے نہ کہ شیخین کو برا کہنے کی وجہ سے۔

اگر ضیاء الرحمٰن فاروقی اور اس کا سیاسی ٹولہ ذوق سلیم سے تعصب

کا چشمہ ایک طرف رکھ کر تاریخ شیعیت کے آغاز کا مطالعہ کریں تو ان کو معلوم ہو گا کہ یہ کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ جہاں دین مبین اسلام شروع ہوتا ہے وہیں سے بانی اسلام سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام نے ساتھ ساتھ شیعیت کا پودا لگایا۔ اس کی آبیاری کی اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں پھولنے لگا مگر پھیلنے نہ پایا تھا کہ چراغ نبوت گل ہوگیا۔ اس دعویٰ میں شیعہ منفرد نہیں بلکہ جمہور اسلام کے رواۃ اور محدثین اور علماء اسلام بھی شریک نظر آتے ہیں۔

احمد بن حنبل، ابن حجر، زمخشری، نسائی اور ابن اثیر، تمام علماء کرام نے ابن عباس اور حضرت علیؑ وغیرھم سے یہ روایت کی ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عموماً حضرت علیؑ سے فرمایا کرتے تھے انت و شیعتک ھم الفائزون یوم القیامۃ "اے علیؑ! تم اور تمہارے شیعہ ہی قیامت کے دن رستگار ہوں گے۔ ان علماء کے علاوہ اہل حدیث نے بھی اس حدیث کو مختلف طروق سے بیان کیا ہے۔ تاریخ و حدیث کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے عہد نبویؐ میں صحابہ کرام کا ایک گروہ جناب امیرؑ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حضرت علیؑ کو اپنا روحانی پیشواء تعلیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی مبلغ نیز احکام و اسرار نبوت کا واقعی شارح اور مفسر تسلیم کرتا ہے اور شیعہ کے نام

سے شہرت پاتا ہے صحابہ کی ایک جماعت تو پہلے ہی حضرت علیؑ کے ساتھ تھی مگر پیغمبر اسلامؐ کے بعد سیاسی مناقشات کے دور میں اور بھی بہت سے صحابہ کرام نے آپ کی محبت اختیار کرلی۔ سلمانؓ، عمارؓ، ابوذرؓ، مقدارؓ، خزیمہؓ، ذوالشہادتین اور ابو ایوب انصاریؓ ایسے اسی سربر آوردہ صحابی اور بعد میں خصال شیخ صدوقؒ کی روایت کے مطابق بارہ ہزار صحابہ، بدری اور عقبی مہاجرین و انصار ایسے تھے جو حضرت علی علیہ السلام کی حمایت میں شامل ہوگئے اور ان میں سے اکثر نے جنگ جمل اور حرب صفین میں اپنی اپنی جانیں قربان کیں۔ (ماخوذ از اصل و اصول شیعہ) بحوالہ کتاب عبداللہ بن سبا از فاضل اجنالوی)

اشتہار زیر بحث میں یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ شیعہ اٹھتے بیٹھتے یا علیؑ کا ورد کرتے ہیں تو ان کے اضافہ معلومات کے خاطر عرض ہے کہ شیعہ حضرت علیؑ کو خدا، نبی، رسولؐ سمجھ کر ان کے نام کا ورد نہیں کرتے بلکہ بموجب ارشاد پیغمبرؐ ذکر علی عبادۃ "علی کا ذکر عبادت ہے۔" (ارجح المطالب صفحہ 97 بحوالہ کنز العمال دیلمی وغیرہ) عبادت خدا سمجھ کر کرتے ہیں اور اللہ کا ولی اور نبی کا وصی سمجھ کر کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

مشغول حق ہوں بندگی' بو تراب میں

نیز شیعیان علیؑ پر یہ سراسر اتہام اور غلط الزام ہے کہ انہوں نے اسلامی سلام ''السلام علیکم'' کی بجائے کوئی نیا سلام ایجاد کرلیا ہے۔ (یعنی یا علی مدد) حاشا وکلا۔ کوئی بھی باخبر شیعہ اسے اسلامی سلام کی جگہ سلام نہیں سمجھتا بلکہ بعض حضرات اسلامی سلام کے بعد بطور وسیلہ (اپنے اور خدا کے درمیان حضرت علیؑ کو وسیلہ سمجھ کر) یا علیؑ مدد کہہ لیتے ہیں تاکہ مومن و منافق کی پہچان ہوسکے۔ فرمایئے اس میں غلو یا شرک کی کون سی بات ہے؟ وسیلہ اختیار کرنے کا خود خدا نے حکم دیا ہے۔ ''یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ اسی طرح پ 6 سورہ المائدہ ع 6 کی ایک آیت میں ارشاد خداوندی ہے اور اس کے حضور میں مقرر وسیلہ پہنچانو۔ یعنی خدا سے بذریعہ امام تقرب حاصل کرو۔ کیونکہ آئمہؑ دین کی رسی خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ سفارش کرنا وسیلہ کا کام ہے اور کام کرنا خدا کا کام اب کوئی بتائے کہ یہ شرک ہے یا عین توحید؟ اور اگر لفظ ''یا'' کے استعمال پر اعتراض ہے تو نحو کی تمام کتابوں میں لکھا ہے کہ لفظ یا قریب وبعید ہر دو کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

شیعیان حیدر کرار حضرت علی علیہ السلام یا دوسرے کسی امامؑ کو نہ

خدا سمجھتے ہیں اور نہ خدا کی کسی صفت خاصہ میں شریک سمجھتے ہیں۔ شیعہ خداوند عالم کو ذات ' صفات ' افعال اور عبادت میں واحد لاشریک مانتے ہیں۔ جو لوگ آئمہ طاہرین کو خدا یا خدا کا شریک جانتے ہیں شیعہ ان کو یہود و نصاریٰ سے بدتر مشرک و کافر جانتے ہیں۔ (ملاحظہ ہوں کتب عقائد شیعہ خصوصاً رسالہ عقائد شیخ صدوق معہ شرح احسن الفوائد مصنفہ علامہ الحاج شیخ محمد حسین صفحہ 421 طبع اول)

فاروقی کا شیعوں پر یہ سراسر بے بنیاد اتہام اور غلط الزام ہے کہ شیعہ حضرت علیؑ کو نبی آخرالزمانؐ کا ہم پلہ جانتے ہیں۔ بے شک خداوند کریم نے حضرت علیؑ کو قرآن میں نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خاتم النبیینؐ نے ان کو دین و دنیا میں اپنا بھائی قرار دیا ہے ' مگر پھر شیعہ حفظ مراتب کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ اگرچہ شیعہ حضرت علیؑ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بہتر و برتر اور افضل سمجھتے ہیں۔ مگر جہاں تک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات باصفات کا تعلق ہے ---- جناب علیؑ کے الفاظ میں کہ انا عبد من عبید محمد (میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم پلہ اور ہم پایا نہیں بلکہ ان کا مخلص غلام جانتے ہیں۔ (اصول ۔ کافی ۔ احتجاج طبرسی وغیرہ) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام ' خلیفہ بلافصل ' جانشین اور ہادی برحق خلائق اجمعین سمجھتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے حضرت علی علیہ السلام کے متعلق اگر کوئی فرقہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے محفوظ اور میانہ روی پر گامزن ہے تو وہ صرف فرقہ شیعہ خیر البریہ ہے باقی سب مکاتب فکر یا غالی ہیں یا قالی ہیں یعنی یا حد سے بڑھانے والے ہیں یا حد سے گھٹانے والے ہیں۔

مسئلہ جمع بین صلاتین

جن نظریات و آراء کے حوالے سے شیعوں پر اعتراض کیا جاتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ شیعہ ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اکھٹی پڑھتے ہیں معترض جو اس سلسلے میں شیعوں پر اعتراض کرتے ہیں ان کا خیال ہے گویا وہ خود نماز صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے=

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا"

"مومنین پر نماز وقت مقررہ پر فرض کی گئی ہے"

اسلام کے تمام مکاتب فکر کا اس پر تو اتفاق ہے کہ ۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھی جائیں۔ اس کو "جمع تقدیم" کہتے ہیں اور مزدلفہ میں اس دن مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھی جائیں۔ اسے "جمع تاخیر سے" تعبیر کرتے ہیں اس پر کبھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؟ اور کبھی کسی ملا نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی

آخر ایسا کیوں؟

شعیہ و سنی کا اختلاف اس میں ہے کہ کیا ظہر اور عصر کی نمازیں اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں پورے سال سفر کے عذر کے بغیر بھی جمع کرنی جائز ہیں؟

حنفی حضرات صریح نصوص کے باوجود جمع کرنے کی اجازت کے قائل نہیں، یہاں تک کہ سفر کی حالت میں بھی اکھٹی نمازیں پڑھنے کو عشرہ جائز نہیں سمجھتے۔ اس طرح حنفی مکاتب فکر کا طرز عمل اس اجماع امت کے خلاف ہے جس پر شیعوں اور سینوں دونوں کا اتفاق ہے۔

لیکن مالکی، شافعی اور حنبلی سفر کی حالت میں دو فرض نمازوں کے اکھٹا پڑھ لینے کے جواز کے قائل ہیں، لیکن ان میں اس پر اختلاف ہے کہ کیا خوف، بیماری، بارش وغیرہ کے عذر کی وجہ سے بھی دو نمازوں کا اکٹھا پڑھ لینا جائز ہے۔

شیعہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ "جمع بین الصلاتین" مطلقاً جائز ہے اور اس کے لیے سفر، بیماری یا خوف وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ شیعہ اس سلسلے میں آئمہ اہل بیتؑ کی ان روایات پر عمل کرتے ہیں جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ ان آئمہ معصومین علیہم السلام کی پیروی کرتے ہیں جو قرآن و سنت کا پورا علم رکھتے ہیں۔

شیعہ اثنا عشریہ کی دلیل "جمع بین الصلاتین" کے بارے میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں دو فرض نمازوں کو جمع کیا ہے اور اس وقت آپ سفر میں نہ تھے' نہ کوئی خوف تھا' نہ بارش ہو رہی تھی۔ اور نہ کوئی ضرورت تھی۔ صرف مسلمانوں سے تنگی رفع کرنے کے لیے آپؐ نے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا۔ اور یہ بات شیعہ کے ہاں آئمہ اطہار علیہم السلام کی روایات سے بھی ثابت ہے اور علمائے اہلسنّت والجماعت کی روایات سے بھی ثابت ہے۔

تحقیق کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انصاف سے کام لے' اور تحقیق سے اس کا مقصد محض رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اس طرح امید ہے کہ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی حدیث کی معتبر کتابوں میں لکھا ہے' اور وہ روایات یہ ہیں جو جمع بین الصلاتین کے بارے میں علمائے اہل سنت نے بیان کی ہیں۔ ان کو پڑھ کر آپ کو یقین ہو جائے گا کہ جمع بین الصلاتین کوئی شیعہ بدعت نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں ابن عباس سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب وہ مدینے میں مقیم تھے' مسافر نہیں تھے سات اور آٹھ رکعتیں پڑھیں (احمد بن حنبل مسند جلد ا صفحہ ۲۲۱)

امام مالک نے موطا میں ابن عباس سے روایت بیان کی ہے وہ کہتے

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر خوف اور سفر کے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھیں اسی طرح مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ (امام مالک موطا شرح الحوالک جلد ا صفحہ ۱۶۰)

صحیح مسلم میں باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر میں ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں اکھٹی پڑھیں۔

اسی باب میں صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع بین الصلاتین کی سنت صحابہ میں مشہور تھی اور اس پر صحابہ عمل بھی کرتے تھے۔

صحیح مسلم کے اسی باب کی ایک روایت ہے۔ ایک روز ابن عباس نے عصر کے بعد خطبہ دیا۔ ابھی ان کا خطبہ جاری تھا کہ سورج ڈوب گیا۔ ستارے نکل آئے۔ لوگ بے چین ہو کر الصلواۃ الصلواۃ پکارنے لگے۔ بنی تمیم میں سے ایک گستاخ شخص الصلواۃ الصلواۃ کہتا ہوا ابن عباس تک پہنچ گیا۔ ابن عباس نے کہا۔ تیری ماں مرے تو مجھے سنت سکھاتا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھتے دیکھا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ۔ ابن عباس نے اس شخص سے کہا کہ

تیری ماں مرے تو ہمیں نمازیں سکھاتا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جمع بین الصلاتین کیا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۱ - ۱۵۲ باب الجمع بین الصلاتین)

باب وقت المغرب میں صحیح بخاری کی روایت ہے۔ جابر بن زید کہتے ہیں کہ ابن عباس کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات رکعتیں اکٹھی اور آٹھ رکعتیں اکٹھی پڑھیں۔ (صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۴ باب وقت المغرب)

اسی طرح بخاری نے باب وقت العصر میں روایت بیان کی ہے کہ ابو امامہ کہتے تھے کہ "ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی' پھر ہم وہاں سے نکل کر انس بن مالک کے پاس پہنچے دیکھا تو عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں میں نے پوچھا چچا میاں یہ آپ نے کون سی نماز پڑھ لی؟ کہنے لگے کہ عصر کی' اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز ہے جو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۳۸ باب وقت العصر)

اہل سنت کی صحاح کی احادیث کے اس مختصر جائزے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان روایات کے پڑھتے وقت ضیاء الرحمٰن فاروقی اور ان کے سپاہ صحابہ آخر شیعہ کو برا بھلا کیوں کہتے ہیں؟ اور ان پر کیوں بے جا اعتراض کرتے ہیں۔؟ بیشک اللہ سبحانہ کا حکم ہے۔ "ان الصلوۃ کانت

علی المومنین کتابا موقوتا" لیکن اس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے دو طرح سے کی ہے۔ الگ الگ نمازوں سے بھی اور جمع بین الصلاتین سے بھی۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ پانچ نمازیں مختلف اوقات میں بھی پڑھی جاسکتی ہیں اور تین اوقات میں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ جب مسلمان عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز کے لیے اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے حضرت رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے دو نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس امت کے متاخرین سے تنگی دور کر دی اور دین کو آسان بنا دیا مسلمان کیوں حضرت رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل نہیں کرتے؟ جب کہ عرفات اور مزدلفہ میں حج کے ایام جمع بین الصلاتین کے لیے قرآن میں کوئی آیت نہیں اور نہ ہی پانچ وقت نماز علیحدہ پڑھنے کے متعلق کوئی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جو وحی بھیجتا تھا ضروری نہیں کہ وہ قرآن میں ہی ہو اور وحی متلو ہی ہو۔

(قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر و قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر سب سمندر میرے لیے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی اگرچہ ہم اور سمندر اس کی مدد کے

لیے لے آئیں۔" (سورۂ کہف آیت ۱۰۹)

جسے ہم سنت نبوی ؐ کہتے ہیں وہ بھی وحی الٰہی ہی ہے اسی لیے اللہ سبحانہ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ :

"وما اتاکم الرسول فخذوا وما نھاکم عنه فانتھوه"

جس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔ بالفاظ دیگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کو کسی کام کا حکم دیتے تھے' یا کسی کام سے منع کرتے تھے تو صحابہ کرام کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ آپ پر کوئی اعتراض کرتے یا آپ سے یہ مطالبہ کرتے کہ کلام اللہ کی کوئی آیت پیش کریں۔ وہ آپ کے حکم کی تعمیل یہ سمجھ کر کرتے تھے کہ آپ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتا ہے۔

جمع بین الصلاتین یہ حکمت ہے کہ جمع بین الصلاتین کی صورت میں سب ملازمت پیشہ' طلبہ اور کارخانوں میں کام کرنے والے کاریگر اور عوام نماز وقت پر ادا کرسکتے ہیں اور ان کا دل مطمئن رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کامطلب کہ کی لا احرج امتی (میں اپنی امت کو ضیق میں نہ ڈالوں)

خاک کربلا پر سجدہ

شیعیان حیدر کرار کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے لہٰذا اس سلسلے میں وہ آئمہ اہل بیتؑ اور ان کے جد امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول نقل کرتے ہیں:

"افضل السجود علی الارض"

"سجدہ زمین پر کرنا افضل ہے"

ایک اور روایت میں ہے کہ

"لا یجوز السجود علی الارض اوما انبتت الارض غیر ماکول ولا ملبوس"

"سجدہ جائز نہیں ہے مگر زمین پر یا اس چیز پر جو زمین سے اگی ہو، مگر نہ کھائی جاتی ہو اور نہ پہنی جاتی ہو۔

وسائل الشیعہ میں محدث اعظم حرعاملیؒ نے اپنی اسناد سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"السجود علی الارض لا نه ابلغ فی التواضع والخضوع

للہ عزوجل"

"زمین پر سجدہ کرنا افضل ہے کیونکہ اس سے انتہائی تواضع اور خشوع و خضوع کا اظہار ہوتا ہے"

ایک اور روایت میں ہے جو اسحاق بن فضل سے منسوب ہے اسحاق کہتے ہیں کہ:

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ مولا! کیا چٹائیوں پر اور سرکنڈوں سے بنی ہوئی بوریوں پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں، مگر میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ زمین پر سجدہ کیا جائے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات پسند تھی کہ آپ کی پیشانی زمین پر ہو اور میں تمہارے لیے وہی بات پسند کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند تھی۔

مسلمانوں کے دیگر مکاتب فکر کے علماء قالین یا دری وغیرہ پر بھی سجدہ میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اگرچہ ان کے نزدیک بھی افضل یہی ہے کہ چٹائی پر سجدہ کیا جائے۔

مسلم اور صحیح بخاری کی بعض روایات بتلاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھجور کے پتوں اور مٹی سے بنی ہوئی نہایت چھوٹی سی جانماز تھی جس پر آپ سجدہ کیا کرتے تھے۔

مسلم کہتے ہیں کہ چھوٹی سی جانماز کو خمرہ کہتے ہیں۔ اتنی چھوٹی کہ

بس اس پر سجدہ کیا جاسکے۔ بی بی عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا کہ ذرا یہ خمرہ مجھے مسجد سے اٹھا دینا۔ میں نے کہا۔ مجھے تو ماہواری آ رہی ہے' آپ نے فرمایا تمہاری ماہواری تمہارے ہاتھ میں تھوڑا ہی ہے۔ (صحیح مسلم جلد' باب جواز غسل الحائض راس زوجہا سنن الاداؤد جلد ا باب الحائض تناول من المسجد)

بخاری نے اپنی صحیح میں ابو سعید خدری سے روایت بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زمین پر سجدہ کرنا پسند فرماتے تھے۔

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے درمیانی عشرے میں اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے اعتکاف کیا جب اکیسویں کی شب ہوئی اور یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو آپ اعتکاف سے نکلنے والے تھے۔ آپ نے اس رات آنے پر فرمایا "جس نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہو وہ رمضان کے آخری دس دنوں کا بھی اعتکاف کرے میں نے وہ رات (لیلتہ القدر) دیکھی تھی۔ پھر مجھے بھلا دی گئی۔ میں نے دیکھا تھا کہ میں اس رات کی صبح کو گیلی مٹی پر سجدہ کر رہا ہوں اس لیے تم اسے آخری دس راتوں میں اور طاق راتوں میں تلاش کرو۔"

"اس کے بعد اس رات بارش ہوئی' مسجد کی چھت کھجور کی

ٹہنیوں اور پتیوں کی بنی ہوئی تھی۔ ٹپکنے لگی۔ میرے آنکھوں نے ۲۱ کی صبح کو رسول اللہ ﷺ کی پیشانی پر گیلی مٹی کا نشان دیکھا۔" (صحیح بخاری جلد ۲ باب الاعتکاف فی العشر الاواخر)

صحابہ کرام بھی خود رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں زمین پر ہی سجدہ کرنا پسند کرتے تھے۔ امام نسائی نے اپنی سنن میں روایت بیان کی ہے کہ:

"جابر بن عبداللہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھا کرتے تھے، میں ایک مٹھی کنکریاں ٹھنڈی کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیتا تھا، پھر دوسرے ہاتھ میں لے لیتا تھا، جب سجدہ کرتا تو انہیں وہاں رکھ دیتا، جہاں پیشانی رکھنی ہوتی۔ (سنن امام نسائی جلد ۲ باب تبرید الحصی للسجود علیہ)

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(جلعت فی الارض مسجدا او طھورا)

"میرے لیے زمین سجدہ کرنے اور پاک کرنے کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔" (صحیح بخاری، کتاب التیمم)

ایک اور حدیث نبوی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"جعلت لنا الارض کلھا مسجدا وجعلت تربتھا لنا طھورا"

"میرے لیے تمام زمین سجدہ گاہ اور اس کی خاک پاکی کا ذریعہ بنادی گئی ہے۔" (صحیح مسلم جلد ۴ کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ)

آیت اللہ العظمی ابو القاسم الموسوی الخوئی اپنی کتاب "البیان فی تفسیر القرآن" میں فرماتے ہیں۔ شیعہ عقیدے کی رو سے امام حسینؑ کی قبر کی خاک بھی اللہ کی اسی وسیع و عریض زمین کا ایک حصہ ہے، جسے اس نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے طاہر، مطہر اور جائے سجود قرار دیا ہے، تاہم کیسی طاہر اور مقدس ہے وہ خاک جو نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے اور جس میں جوانان بہشت کے سردار آرام فرما رہے ہیں۔ اس خاک کے پہلو میں وہ عظیم ہستی محو خواب ہے جس نے اپنے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد کو زندہ کرنے، انسانوں کو آزادی دلانے اور ظلم و ستم کو مٹانے کے لیے اپنے فرزندوں، عزیزوں اور وفادار ساتھیوں کو راہ خدا میں قربان کر دیا۔ یہ خاک! خاک کربلا انسانوں کو راہ خدا میں جان کی بازی اور فداکاری کا سبق سکھاتی ہے۔ انہیں شرافت و فضیلت کا درس دیتی ہے اور ایک عدیم النظیر جگر سوز تاریخی واقعے کی یاد ذہن انسانی میں تازہ کرتی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر اس خاک کی ایک خاص اہمیت اور عظمت ہے اور اس پر سجدہ کرنا شرعاً صحیح ہے۔ اس سبب کے علاوہ کربلا کی مٹی کی فضیلت میں متعدد روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے جو شیعہ اور سنی دونوں ذرائع سے نقل ہونی ہیں۔

استاد شہید مرتضٰی مطہری اپنی کتاب ”شہید“ میں فرماتے ہیں:

”جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمتہ الزہرا سلام اللہ علیھا کو مشہور تسبیحات ۳۴ بار اللہ اکبر، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار سبحان اللہ) پڑھنے کو کہا تو وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی قبر پر گئیں، اور تسبیح تیار کرنے کے لیے وہاں سے کچھ مٹی حاصل کی، ان کے اس فعل کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی اہمیت یہ ہے کہ شہید کی قبر متبرک ہے اور اس کے ارگرد کی مٹی بھی متبرک ہے۔ انسان کو تسبیحات پڑھنے کے لیے ایک تسبیح کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس مقصد کے لیے پتھر، لکڑی کی بنی ہوئی تسبیح استعمال کی جاسکتی ہے، لیکن ہم شہید کی قبر کے پاس کی مٹی کو ترجیح دیتے ہیں، اور اس سے ہمارا مقصد شہید کی تعظیم بجا لانا ہوتا ہے“

پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان خصوصاً ضیاء الرحمٰن فاروقی اور اس کے غیر مقلد پیروکار شیعوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرکے انہیں مطعون کرتے ہیں کہ ”شیعہ قالینوں کے بجائے مٹی پر سجدہ کرتے ہیں“

نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیعوں کی تکفیر کی گئی، انہیں برا بھلا کہا گیا اور ان پر بہتان باندھا گیا کہ وہ بت پرستی کرتے ہیں اور بت پرست ہیں۔

اگر شیعوں کی جیب یا سوٹ کیس میں سے خاک کربلا کی ٹکیہ نکل آئے' تو اتنی سی بات پر شیعہ حاجیوں کو سعودی عرب میں زدو کوب کیا جاتا ہے۔ مولوی فاروقی کے روحانی رہنما اور شہزادے حکمران شیعیان علیؑ کے ساتھ اس طرح کیوں سلوک کرتے ہیں۔؟

کیا یہی وہ اسلام ہے جو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ایک دوسرے کا احترام کریں؟ اور کسی کلمہ گو موحد مسلمان کی جو اللہ کی نماز پڑھتا ہو' زکوٰۃ دیتا ہو' رمضان کے روزے رکھتا ہو اور بیت اللہ کا حج کرتا ہو توہین نہ کرے؟ کیا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس یہ تصور کرسکتا ہے کہ اگر بعض لوگوں کا یہ الزام درست ہوتا کہ شیعہ پتھروں کی پوجا کرتے ہیں--- تو کوئی شیعہ اتنی تکلیف اٹھا کر' اور اتنا مالی بوجھ برداشت کرکے' حج بیت اللہ اور زیارت قبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے آتا؟

"شیعہ کہتے ہیں کہ ہم مٹی پر سجدہ کرتے ہیں۔ مٹی پر سجدہ کرنے میں اور مٹی کو سجدہ کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔"؟

اگر شیعہ احتیاط کرتے ہیں کہ ان کا سجدہ پاک جگہ پر ہو اور عنداللہ مقبول ہو۔ تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہار علیہم السلام کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ خصوصاً اس زمانے میں جب سب مساجد میں موٹے موٹے روئیں دار قالینوں کے فرش بچھ گئے ہیں۔ قالینوں

میں بعض کی بناوٹ میں ایسا مواد استعمال کیا جاتا ہے جس سے عام مسلمان ناواقف ہیں۔ اکثر قالین مسلمان ملکوں کے بنے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی بناوٹ میں ایسا مواد استعمال کیا گیا ہو جو شرعاً جائز نہیں۔ ایسی صورت میں کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس شیعہ کو جو نماز کی صحت کا اہتمام کرتا ہو' دھتکار دیں اور محض بے بنیاد شبہ کی وجہ سے اس پر کفر و شرک کا الزام لگائیں؟

شیعہ جو دینی امور میں بہت محتاط ہے خصوصاً نماز جو دین کا ستونِ ہے' نماز کے وقت کمر بند گھڑی وغیرہ اتار دیتا ہے' کیونکہ اس کا تسمہ چمڑے کا بنا ہوتا ہے' جس کی اصل معلوم نہیں' بعض اوقات پتلون اتار کر ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہن کر نماز پڑھتا ہے' اور یہ سب احتیاط اور اہتمام اس لیے کرتا ہے کہ اسے نماز میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ اپنے رب کے سامنے اس حال میں جائے کہ اس کے رب کو اس کی کوئی بات ناپسند ہو۔

کیا ایسا شیعہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے؟ اس سے نفرت کی جائے؟ وہ تو اس قابل ہے کہ اس کا احترام کیا جائے' اس کی تعظیم کی جائے' کیونکہ وہ شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے جو

تقویٰ کی بنیاد ہے۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور صحیح بات کہو۔

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' تو جس مشغلے میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب نازل ہوتا۔ اس وقت جب تم اس کو اپنی زبانوں سے دہرا رہے تھے اور اپنے منہ سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کا تمہیں علم نہیں تھا اور اس کو معمولی بات سمجھتے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی۔" (سورہ نور آیت ۱۵)

اے اللہ! ہم سب مسلمانوں کو خیر و تقویٰ کی توفیق دے ان کی صفوں میں اتحاد اور دلوں میں اتفاق پیدا کر' ان کی خرابیوں کی اصلاح کر اور انہیں دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی عطا کر۔

صحابہ کے بارے میں شیعہ سنی نظریہ

اہم ترین مباحث جو حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے والے تمام تر موضوعات کا اصل محور ہے۔ اصحاب تمام امور کی اساس ہیں۔ ہم نے دین ان ہی سے حاصل کیا ہے۔ ہم آج بھی ان کے چراغ سے روشنی لے کر گمراہی کی ظلمتوں کا پردہ چاک کرتے ہیں' تاکہ اللہ جل جلالہ کے نورانی احکام تک پہنچیں۔ اور چونکہ علمائے اسلام اس امر سے واقف تھے لہذا انہوں نے ان کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے ہیں۔

علمائے اہل سنت نے اس سلسلے میں "اسد الغابۃ فی تمیز الصحابہ الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ" "میزان الاعتدال" اور کئی دوسری گرانقدر کتابیں تالیف کی ہیں جو بعض مکتب فکر کی نگاہ سے اصحاب کی بائیوگرافی کو معرض نقد و نظر میں لاتی ہیں۔

اس سلسلے میں جو مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ اوائل اسلام کے علماء' تاریخ لکھنے میں ایسا طریقہ اختیار کرتے تھے جو اموی یا عباسی حکمرانوں

کے فکر و خیال کے مطابق ہوتا تھا جب کہ یہ حکمران اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بہت کینہ اور بے حد عداوت رکھتے تھے' یہی نہیں' بلکہ یہ حکمران ہراس شخص کے خلاف دشمنی رکھتے تھے جو اہل بیت کا پیروکار تھا' یا ان سے دوستی اور ان سے محبت کرتا تھا۔ اس بنا پر انصاف کی بات یہ نہیں ہے کہ ہم محض ان کی تحریروں پر اطمینان کرلیں اور ان تحریروں کو کافی سمجھ لیں اور ان تمام مسلمان علماء کے اقوال درخور اعتناء نہ سمجھیں جن کو ان حکمرانوں نے صرف اس جرم کی پاداش میں (کہ وہ اہل بیت کے پیرو تھے اور ان استبدادی اور ظالم حکومتوں میں انقلاب کے خواہاں تھے) دبایا' ملک بدر کیا پابند سلاسل کیا اور بے دردی سے قتل کر دیا۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے اصل مشکل خود اصحاب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصیت نامہ لکھنے کے باب میں اختلاف کیا۔ یہ وصیت نامہ لکھے جانے کی صورت میں انہیں قیامت تک گمراہی سے بچاتا۔ اور یہی وہ اختلاف تھا کہ جس نے امت اسلامیہ کو ہمیشہ ہمیشہ لے لیے اس فضیلت سے محروم کر دیا۔ اسے گمراہی کی وادی میں کھینچا اور نتیجتاً وہ متفرق ہوگئے اور آپس میں کشمکش برپا ہوئی۔ تنازعات کھڑے ہوئے سقوط کا شکار ہوئے' اور ان کی عزت جاتی رہی' وہ خود ہی تھے جنہوں نے خلافت کے معاملے میں اختلاف کیا اور دو گروہوں میں تقسیم

ہو گئے۔

حزب اقتدار اور حزب اختلاف

شیعیان علیؑ اور شیعیان معاویہ

اور پھر انہوں نے خود ہی قرآن کی تفسیر اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اختلاف کیا جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فرقوں نے جنم لیا۔ کلامی اور فکری مکاتب نے جنم لیا، قسم قسم کے فلسفوں نے ظہور کیا۔ جن کے پیچھے صرف سیاسی اغراض و مقاصد تھے اور لوگ سلطنت اور حکومت تک رسائی کے راستے تلاش کرتے تھے۔

اگر صحابہ یہ طرز عمل اختیار نہ کرتے تو مسلمان متفرق اور پراگندہ نہ ہوتے۔ آج اسلام میں جو اختلاف ظاہر ہوتا ہے وہ لوٹ کر اصحاب کے اختلاف کی طرف جاتا ہے۔ کیونکہ سب مسلمانوں کا خدا ایک ہے، قرآن ایک ہے، نبی ایک ہے، قبلہ ایک ہے اور ان امور میں سب کا اتفاق ہے، سب کا اتحاد ہے، لیکن اختلاف پہلے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ سے شروع ہوا جو آج تک چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

مذہب شیعہ خیر البریہ میں کسی کو گالی دینا جائز نہیں شیعہ تو بموجب ارشاد رب العزت "ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا" بغیر علم کفار و مشرکین کو بھی سب و شتم کرنا ناجائز سمجھتے ہیں۔ چہ

جائیکہ متطاھرین اسلام کو سب و شتم کریں؟

ہاں لعنت جس کے معنی رحمت خداوندی سے دوری کے' اور تبرا جس کے معنی بیزاری اختیار کرنے کے ہیں یہ اور چیز ہے جس کا جواز قرآن و حدیث اور اکابرین امت کے عمل سے ثابت ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی شخص اس وقت تک درجہ ایمان پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک وہ بانی اسلام حضرت رسول اللہ ﷺ کی ذات قدسی صفات کو خدا کے بعد ہر شئے سے حتی کہ اپنی جان و اولاد سے زیادہ عزیز و محبوب نہ سمجھتا ہو۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔ النبی اولی بالمومنین من انفسھم اور خود آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے "لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من ولدہ و اولادہ و نفسہ والناس اجمعین (شفاء قاضی عیاض ۔ کنز الایمان وغیرہ) کوئی شخص اس وقت تک مومن کہلا نہیں سکتا جب تک مجھے اپنی اولاد' اپنے والد اور اپنے نفس بلکہ تمام لوگوں سے محبوب نہ سمجھے' اور یہ فطرت کا اصول ہے کہ محبوب کی ہر شئی محبوب ہوتی ہے۔ اس لیے کہاوت ہے کہ دوست کا دوست' دوست سمجھا جاتا ہے' اور دوست کا دشمن' دشمن سمجھا جاتا ہے۔

بنا بریں یہ کہ کس طرح ممکن ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے محبوب صحابہ کو برا سمجھ کر کوئی شخص مومن کہلا سکے۔ صحابہ کرام کی چند وجوہ

سے محبت لازم ہے۔ ایک اس لیے کہ وہ مومن ہیں۔ (و کل مومن اخوہ) مومن بھائی بھائی ہے۔ مومن کی محبت مومن پر واجب و لازم ہے لہٰذا صحابہ کرام کی محبت مومن کا ایمانی فریضہ ہے۔ دوسرے اس لیے صحابہ ناصر اسلام ہیں اور ناصر اسلام ناصر رسولؐ ہیں ظاہر ہے کہ اپنے آقاو ہادی کے ناصر کی محبت فطرتاً لازم ہے۔ سوم اس لیے کہ صحابہ کرام بوجہ جہاد فی سبیل اللہ محبوب خدا ہیں ۔ (ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ) لہٰذا محبوبین خدا کی محبت و مودت لازم ہے۔

چہارم اس لیے کہ اصحاب رسول شیعیان رسولؐ اور آپ کی اتباع کرنے والے محبوب خدا ہیں۔ واضح رہے کہ محبوب خدا کی محبت ہر اس بندہ پر جو خدا سے محبت رکھتا ہے' واجب ہے ان دلائل سے واضح ہوا کہ جو حقیقی اصحاب رسول ہیں ان کی محبت جزو ایمان ہے ان کی محبت کے بغیر کوئی شخص درجہ ایمان پر فائز و کامران نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ محقق شیخ بہائی اپنے رسالہ اعتقادات امامیہ میں تحریر فرماتے ہیں=

(تعتقد وجوب محبتہ اصحاب الرسول الذین اقاموا اعلی متابعتہ ولم یتخالفوا اوامرہ بعد وفاتہ و انفاذ ما اوماھم بہ حال حیوتہ)

"ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت واجب

ہے' جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت پر قائم و دائم رہے' اور ان کی وفات کے بعد ان کے احکام و وصایا کی مخالفت نہ کی۔ یہی شیعیان حیدر کرارؑ کا عقیدہ و ایمان ہے۔ وہ محبت اصحاب رسولؐ اور ان کے لیے دعا خیر اپنے آئمہ اطہار علیہم السلام کی تقلید و تاسی میں اپنا ایمانی وظیفہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے چوتھے امام حضرت زین العابدین علیہ السلام کے صحیفہ کاملہ میں ایک دعائے مخصوص اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے موجود ہے اس دعا کا عنوان یہ ہے=

و کان من دعائه علیه السلام فی الصلو ة علی اتباع الرسول و مصدقیهم

اس دعا میں آپؑ فرماتے ہیں

"اللهم و اصحاب محمد صلی الله علیه واله وسلم خاصته الذین احسنوا الصحابه والذین ابلوا البلاء الحسن فی نصره و کانفوه واسرعوا الی و فادته و سابقوا الی دعوته"

"یااللہ! خاص کر حضرت رسولؐ کے ان اصحابہ کرام کو نظرانداز نہ فرما' بلکہ ان کو جزائے خیر دے جنہوں نے آپ کا اچھا ساتھ دیا' اور آپ کی نصرت میں خوب جہاد کیا' اور جناب کی معاونت کی اور ان کی دعوت

قبول کرنے میں سبقت کی۔"

ظاہر ہے کہ اہل تشیع آل محمدؐ کی محبت کے ساتھ ان کی اتباع و اقتداء کو بھی جزو ایمان سمجھتے ہیں' اور ان کو مفترض الطاعۃ جانتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اپنے آئمہ کی اتباع سے صحابہ کرام کے لیے دعائے خیر کرنا جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ "اللھم اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان" اس کے بعد بھی جو یہ کہتا ہے کہ شیعہ اصحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرتے ہیں اور ان کو سب و شتم کرتے ہیں افترا پردازی و بہتان تراشی کرتا ہے۔ یا وہ شیعوں کے عقائد و اعمال سے ناواقف ہے۔ (تتمہ کوکب دری)

ہاں چونکہ کتب سیر و تواریخ بلکہ خود قرآن کریم اور احادیث سید المرسلین سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رسولؐ میں کچھ قاتل کچھ ظالم کچھ مظلوم۔ کچھ عادل اور کچھ غیر عادل کچھ مومن کچھ منافق کچھ ثابت و مستقیم اور کچھ مذبذب و مرتاب غرضیکہ اصحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہر قسم و قماش کے لوگ موجود تھے۔ خلاصہ یہ کہ شیعہ مذہب اس بات کا قائل ہے کہ ان مختلف طبقات کو ایک نگاہ سے دیکھنا اور سب کو "عدول" اور سب کو "کالنجوم" قرار دینا سب سے یکساں محبت ومودت کرنا سب کو اپنا پیرو مرشد جاننا عقل سلیم اور طبع مستقیم پر ظلم

عظیم اور قواعد شریعہ پر جور و ستم ہے۔ بقول جامی

ہر کہ روئی بہبود نداشتے

دیدن روئی نبی سود نداشتے

بعض منصف مزاج علمائے اہل سنت بھی ان حقائق کا اقرار کرتے ہیں چنانچہ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں تحریر فرماتے ہیں(بحذف عربی) صحابہ میں جو جنگ و جدال اور مشاجرات واقع ہوئے جیسا کہ کتب تواریخ میں قابل وثوق حضرات کی زبانوں میں مذکور ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بعض صحابہ راہ راست سے منحرف ہوگئے اور ظلم و جور اور فسق و فجور کی حد تک پہنچ گئے اور ان امور کا سبب باہمی کینہ و عناد اور حسد، طلب، ملک و ریاست اور لذات و شہوات کی طرف رغبت و میلان تھا اس لیے کہ ہر صحابی معصوم نہیں ہوتا اور ہر وہ شخص جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا وہ خیر و خوبی کے ساتھ موسوم نہیں ہوتا۔ (شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۳۰۸ طبع استنبول)

علمائے شیعہ کے نزدیک اصحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین گروہ ہیں۔

پہلا گروہ

پہلا گروہ ان برگزیدہ اصحاب سے عبارت ہے جنہوں نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بخوبی پہچانا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آخری قطرہ خون

تک کے لیے وفاداری کا عہد باندھا۔ ان کے قول میں سچائی اور عمل میں اخلاص تھا۔ دل و جان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کی' اور آپ کے بعد منقلب نہ ہوئے' مرتد نہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بہت سی آیتوں میں ان کی تعریف کی' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی مدح سرائی کی۔ شیعہ انہیں احترام و تکریم کے ساتھ یاد کرتے ہیں جس طرح اہل سنت والجماعت انہیں یاد کرتے ہیں۔

دوسرا گروہ

دوسرا گروہ عبارت ہے ان اصحاب سے جو طمع کے سبب یا خوف کی وجہ سے اسلام لائے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کی۔ لیکن یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر احسان دھرتے تھے' بعض اوقات حضور کو تکلیف پہنچاتے تھے' اور کبھی کبھار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر و نہی کو اہمیت نہیں دیتے تھے' بلکہ نص صریح کے مقابلے میں اپنے مزعومات پر ڈٹے رہتے حتی کہ قرآن کبھی ان کی سرزنش اور کبھی تہدید کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بہت ساری آیتوں میں انہیں رسوا کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی روایات میں انہیں متنبہ کیا اور شیعہ ان کا کوئی احترام اور تائید کے بغیر ان کے کاموں اور رویوں کا ذکر کرتے ہیں۔ (سورہ نساء آیہ ٦٥)

" فَلاَ وَ رَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

لاَ یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَیْتَ وَ یُسْلِمُوْا تَسْلِیْمًا"

"ایسا نہیں ہے تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ (کبھی) مومن نہ ہوں گے جب تک کہ ان جھگڑوں میں جوان کے مابین پڑے ہیں تم کو حاکم نہ بنالیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس طرح تسلیم کرے جیسا کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔"

زبیر بن عوام جو مہاجرین میں سے تھے ان کا ایک انصاری کے ساتھ (جو مدینہ کے مسلمانوں میں سے تھا' ان کا باغوں کے سیراب کرنے کے متعلق جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے) اختلاف ہوگیا' دونوں حضرات اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ زبیر کا باغ نہر کے بلند حصہ کی طرف تھا' اور انصاری کا باغ نشیب میں تھا' اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبیر کو حکم دیا کہ پہلے تم اپنے باغ کو پانی دے لو اور اس کے بعد یہ انصاری مسلمان پانی دے' یہ اس رواج کے مطابق تھا جو ایک دوسرے کے قریب باغوں کے بارے میں تھا لیکن وہ انصاری جو بظاہر مسلمان تھا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصفانہ عادلانہ فیصلے سے ناراض ہو کر کہنے لگا۔ کیا آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ زبیر آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے؟ حضورؐ کو اس کی گفتگو سے تکلیف پہنچی یہاں تک کہ

خداوند عالم اس آیت میں قسم کھا کر فرماتا ہے کہ انسانوں کا ایمان حقیقی اور واقعی اس وقت ہو گا جب وہ اپنے اختلافات میں پیغمبر کو فیصل اور حاکم مانیں' اور دوسروں کی طرف رجوع نہ کریں۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ نہ صرف فیصلہ آپ کے پاس لے کر آئیں' جب آپؐ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو چاہیے وہ ان کے نفع میں ہو یا نقصان میں' نہ صرف یہ کہ وہ زبان اعتراض نہ کھولیں بلکہ ان کا دل بھی مطمئن ہونا چاہیے۔

اسی آیت کی تفسیر میں جو حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے وہ یہ ہے=

"اگر ایک گروہ خدا کی عبادت کرے' نماز پڑھے' زکوٰۃ ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے' اور حج کرے' لیکن ان کاموں کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہے ہیں' کو برا سمجھے یا یوں کہے کہ اگر فلان کام نہ کیا ہوتا تو بہتر تھا وہ دراصل حقیقی مومن نہیں ہے بلکہ منافق ہے۔

یہ آیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام احکامات کی گفتار و کردار میں مطلق اور کامل طور پر پذیرائی یہاں تک کہ دلی طور پر ان کے آگے جھکنا اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ کو احکام خداوندی اور اپنے فیصلوں میں کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ آپؐ جان بوجھ کر خلاف حق کہتے یا کرتے ہیں۔ لہٰذا آپؐ خطا

سے بھی معصوم ہیں اور گناہ سے بھی۔

آیت مندرجہ بالا نص پیغمبرؐ کے مقابلہ میں اجتہاد اور ایسے مسائل میں جن کے بارے میں خدا اور رسولؐ کی طرف سے حکم صریح موجود ہو۔۔۔۔۔۔ اظہار رائے و اظہار عقیدہ کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا اگر تاریخ اسلام ہمیں یہ بتائے کہ بعض لوگ خدا و پیغمبرؐ کے احکام کے مقابلے میں اجتہاد و اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کیا کرتے تھے کہ پیغمبرؐ نے اس طرح کہا ہے اور اس طرح کہتا ہوں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان کا عمل مندرجہ بالا آیت کی صراحت کے بالکل خلاف ہے۔

شیعہ خیر البریہ متذکرہ بالا اصحاب اور ان منافقوں کا جن کا سورہ منافقوں میں ذکر ہوا ہے برات اور دوری اختیار کرتے ہیں ورنہ شیعہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امن باوفا اصحاب کے جنہوں نے اپنی جانیں اور مال مختلف غزوات میں اسلام کی راہ میں قربان کئے ان کے پاؤں کی خاک کو چومتے ہیں اور ان کو بنی اسرائیل کے نبیوں کے برابر مانتے ہیں۔

تیسرا گروہ

تیسرا گروہ عبارت ہے ان منافقین سے جنہوں نے اپنے آپ کو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہلوایا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نگاہ بد سے دیکھتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر اسلام لائے، مگر باطن میں اپنے کفر پر قائم رہے۔ انہوں

نے اپنے آپ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محض اس لیے قربت حاصل کی کہ وہ اسلام اور مسلمان کے خلاف سازش کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں سورۂ منافقوں نازل کی اور بہت سے مقامات پر ان کے مذموم ارادوں سے اپنے محبوب کو آگاہ کیا' اور ان کو جہنم کے سب سے نچلے درجے کی وعید سنائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کا تذکرہ کیا اور مسلمانوں کو ان کے شر سے متنبہ کیا حتی کہ بعض اصحاب کو ان کا نام و نشان بتایا۔ شیعہ اور سنی ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور ان سے بیزاری کا اظہار کرنے میں متحد ہیں۔

ایک اور گروہ بھی ہے جس کے افراد اگرچہ اصحاب میں سے ہیں مگر وہ ایک خصوصی امتیاز کے حامل ہیں۔ اس امتیاز کے اسباب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کا خاندانی رشتہ ان کے اخلاقی و روحانی فضائل اور وہ اوصاف ہیں جن کے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قائل ہوئے اس مخصوص امتیاز میں کوئی شخص ان کا شریک نہیں ہے۔ یہ وہی اہل بیت ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے جن سے رجس کو دور کر دیا اور انہیں پاک اور منزہ قرار دیا ہے۔ (سورہ احزاب آیت ۳۳) ان پر درود و سلام بھیجنا واجب قرار دیا ہے جس طرح کہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا واجب قرار دیا ہے۔ (سورۂ احزاب آیت ۶۵)

ان کے لیے خمس کا ایک حصہ مقرر کیا ہے (سورۂ انفال آیت ۴۱)

رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعزاز میں ان کی محبت و مودت ہر مسلمان پر واجب قرار دی (سورہ شوری آیت ۲۳)

یہ لوگ اولوالامر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے امر کی اطاعت لازم قرار دی۔ (سورہ النساء آیت ۵۹)

یہ لوگ راسخون فی العلم ہیں جو قرآن کی تاویلات جانتے ہیں اور متشابہ کو محکم آیات سے الگ کرتے ہیں۔ (سورۂ آل عمران آیت ۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں "حدیث ثقلین" میں قرآن کے ہم دوش قرار دیا ہے اور دونوں سے تمسک کا حکم دیا ہے (حدیث ثقلین منجملہ ماخذ کے کنز العمال جلد ا صفحہ ۴۴) مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۲)

انہیں کشتی نوح کی مانند قرار دیا کہ جو اس کشتی میں سوار ہو گیا اس نے نجات پائی اور جس نے اس سے منہ موڑا وہ غرق ہوا۔ (حدیث سفینہ' مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۵۱) (تخیص الذہبی ۔ الصواعق المحرقہ صفحہ ۸۴ ۔ ۲۳۴)

اصحاب' اہل بیت کی قدر و منزلت جانتے ہیں اور ان کی تعظیم

و تکریم کرتے ہیں اور شیعہ اہل بیتؑ کی پیروی کرتے ہیں اور ان کو تمام اصحاب پر مقدم رکھتے ہیں۔ ان کی برتری کے قائل ہیں اور اس سلسلے میں کتاب اور سنت سے واضح دلائل رکھتے ہیں۔

لیکن اسلام کے باقی اکثر مکاتب فکر اہل بیتؑ کی فضیلت اور ان کی عزت و احترام کے معترف ہونے کے باوجود صحابہ کی اس تقسیم بندی کے قائل نہیں اور نہ ہی وہ اصحاب میں سے کسی کو منافق مانتے ہیں' بلکہ وہ تو اصحاب کو "بعد از رسول بزرگ توئی" قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ کسی تقسیم بندی کو مانتے ہیں تو وہ سابق الاسلام ہونے اور اسلام کے لیے مصائب و مشکلات برداشت کرنے کے حوالے سے مانتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک سب سے افضل خلفائے راشدین اور ان کے بعد عشرہ مبشرہ کی باقی چھ شخصیات ہیں۔ چنانچہ جب وہ درود پڑھتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ اور آل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ و اصحابہ اجمعین کا لاحقہ لگا کر تمام اصحاب کو درود میں شامل کرتے ہیں۔

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی خلافت و امامت کی نصوص اس قدر کثیر التعداد میں ہیں کہ ان سب کے لیے ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہے۔ علمائے اعلام نے اس سلسلہ میں عربی' فارسی اور اردو وغیرہ میں بہت سی کتب لکھی ہیں یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں البتہ

دو تین آیات اور دو تین روایات لکھ کر مختصر طور پر ان کی تقریب استدلال پیش کی جاتی ہیں۔

ارشاد قدرت ہے=

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

(سورۃ النساء پ ۵ ع ۵)

"اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور ان ذوات کی جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔"

یہ امر اپنے مقام پر پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے۔ کہ صیغہ امر وجوب میں حقیقت ہے جب استحباب کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو اسے وجوب پر ہی محمول کیا جاتا ہے۔ بنا برایں یہاں اسے وجوب پر حمل کرنے کے لیے اگرچہ استحباب کے قرینہ کا نہ ہونا ہی کافی تھا، چہ جائیکہ یہاں تو خود وجوب پر قطعی قرینہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت بالاتفاق واجب ہے اور چونکہ اطاعت اولی الامر بھی اطاعت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقرون ہے لہذا وہ بھی واجب و لازم ہی ہوگی۔ نیز یہ حقیقت ظاہر ہے کہ اطاعت خدا و رسول کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ ہر زمان و مکان اور ہر حال میں ہر مکلف پر واجب ہے اسی طرح اطاعت اولی الامر بھی ہر زبان و ہر مکان اور ہر حال میں ہر شخص پر لازم ہوگی۔ یہ امر

بھی محتاج دلیل نہیں ہے کہ جس بزرگوار کی اس طرح اطاعت مطلقہ واجب ہو اس کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے۔ اس حقیقت کا فخرالدین رازی اپنی تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۳۵۷ طبع اسلامبول پر رقمطراز ہیں=

"اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اَمَرَ بِطَاعَتِہٖ اُولِی الْاَمْرِ عَلٰی سَبِیْلِ الْجَزْمِ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ وَ مَنْ امَرَ اللّٰہُ بِطاعَتِہٖ عَلٰی سَبِیْلِ الْجَزْمِ وَالْقَطْعِ لاَ بُدَّاَنْ یَّکُوْنَ مَعْصُوْما عَنِ الْخَطَاءِ"

"یعنی خداوند عالم نے اس آیت مبارکہ میں وجوبی طور پر اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور جس کی اطاعت وجوبیہ کا خداوند عالم حکم دے اس کے لیے معصوم عن الخطاء ہونا ضروری ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ اولی الامر کو مثل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصمت و طہارت کے درجہ رفیعہ پر فائز ہونا چاہیے اور یہ امر روز روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سوائے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے اور کوئی بھی شخص معصوم و مطہر نہیں ہے۔ ان ذوات مقدسہ کی عصمت و طہارت قرآن کریم و احادیث سید المرسلین اور عقل سلیم کی روشنی میں محقق و مسلم ہے۔ قطع نظر دیگر آیات قرآنیہ کے صرف آیت تطہیر ہی اس مقصد کے اثبات کے لیے کافی ہے۔ (ملاحظہ ہو صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۵۸ الشرف المؤبد صفحہ ۷۷ درمنثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۸ صواعق محرقہ صفحہ

۴۱ ینابیع المودۃ صفحہ ۲۴۵ طبع بمبئی وغیرہ۔ اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ بھی بکثرت ہیں صرف بطور نمونہ ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ ابن عباس بیان کرتے ہیں۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَنَا وَ عَلِیٌّ وَالْحَسَنَ وَالْحُسَیْنُ وَ تِسْعَۃٌ مِنْ وُلِدِالْحُسَیْنِ مُطَھَّرُوْنَ مَعْصُوْمُوْنَ

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں اور علیؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے نو فرزند سب کے سب مطہر اور معصوم ہیں۔ (فرائد السمطین جلد ۲ ینابیع المودۃ باب ۷۱ صفحہ ۱۷۷) معمولی عقل و دانش رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس بزرگ کی اطاعت مطلقہ واجب و لازم ہو وہ یا نبی ہو سکتا ہے یا اس کا وصی۔ لیکن چونکہ اولو الامر نبی خود تو ہیں، نہیں لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اولو الامر اوصیاء نبی ہیں۔

کتاب کفایتہ الاثر اور ینابیع المودۃ وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ اولی الامر نازل ہوئی تو میں نے بارگاہ نبویؐ میں عرض کی۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !

"عَرَفْنَا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَمَنْ اُوْلُوْ الْاَمْرِ الَّذِیْنَ قَرَنَ اللّٰہُ طَاعَتَھُمْ

بِطَاعَتِكَ"

یا رسول اللہ! ہم نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو پہچان لیا ہے مگر یہ اولوالامر کون ہیں؟ جن کی اطاعت کو خداوند عالم نے اپنی اطاعت کیساتھ مقرون کیا ہے؟

" فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ هُمْ خُلَفَائِی يَا جَابِرُ وَ آئِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ بَعْدِیَ وُّلُهُمْ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ ثُمَّ الْحَسَنُ ثُمَّ الْحُسَيْنُ ثُمَّ عَلِی بْنِ الْحُسَيْنُ ثُمَّ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیِّ الْمَعْرُوْفُ فِیْ التَّورَاةِ بِالْبَاقِرِ وَ تَدْرِكُهٗ يَا جَابِرُ فَاِذَا لَقَيْتَهٗ فَاقْرَاهُ مِنِّی السَّلَامُ ثُمَّ اَلصَّادِقُ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ مُوْسٰی بْنِ جَعْفَرِ ثُمَّ عَلِیِّ بْنِ مُوْسٰی ثُمَّ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیٍّ ثُمَّ عَلِیِّ بْنِ مُحَمَّدِ ثُمَّ حَسَنُ بْنُ عَلِیِّ ثُمَّ سُمِّیَ وَ كَنٰی حُجَّةُ اللّٰهِ فِیْ اَرْضِهٖ وَ بَقِيَّةَ فِیْ عِبَادِهٖ ابْنَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍ ذٰلِكٌ الَّذِیْ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰی يَدَيْهِ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبِهَا"

اس حدیث کا مطلب اس قدر واضح و آشکار ہے کہ ترجمہ کی بھی ضرورت نہیں ہے پس جب سرکار ختمی مرتبت نے اپنے حقیقی خلفاء اوصیاء کے نام بنام معرفت کرا دی ہے' تو اب بھی ان کی خلافت و امامت کا اقرار و اعتراف نہ کرنا تعصب بے جا کا مصداق ہی ہو سکتا

ہے۔

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان بے شمار احادیث میں سے جو امامت آئمہ اطہار علیہم السلام پر دلالت کرتی ہیں بنظر اختصار دو حدیثیں پیش کرتے ہیں پہلی حدیث وہ ہے جو متفق علیہ بین الفریقین ہے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے دوسری حدیث بھی متفق علیہ بین الفریقین ہے اور حدیث ثقلین کے نام سے مشہور ہے کہ جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار اور بالخصوص اپنے آخری لمحات حیات میں مجمع اصحاب کو خطاب کر کے فرمایا

"اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَ اِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ" (حدیث نبوی متواتر)

"اے مسلمانو! میں تمہاری رشد و ہدایت کے لیے دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب دوسری اپنی عترت اہل بیت جب تک تم ان دونوں کے دامن کے ساتھ متمسک رہو گے، ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں۔" ہر صاحب دانش و بینش جانتا ہے کہ کسی بھی ملکی نظام کو بطریق احسن چلانے اور باقی رکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک یہ کہ اس کا ایک جامع دستور العمل

اور قانون موجود ہو۔ دوم یہ کہ اس کے نافذ کرنے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والے مخصوص کامل العلم والعمل افراد موجود ہوں۔ اسی طرح جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے بعد نظام دینی کو برقرار رکھنے کے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ قرآن دین کا دستور العمل اور قانون ہے' اور آئمہ اہل بیتؑ اس کے شارع اور نافذ کرنے والے ہیں اور یہی بات اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یہی مسند رسولؐ کے وارث اور ان کے منصب پر ان کے قائم مقام ہیں جنہیں اصطلاح شریعت میں خلیفہ و امام کہا جاتا ہے۔ (وھوا وضح من ان یخفی)

آیت "فاسئلوا اھل الذکر" مسلمانوں کو ہر مشکل کام میں اہل ذکر کی طرف رجوع کرنے کا حکم دے رہی ہے تاکہ مسلمان راہ راست سے آگاہ ہو جائیں' کیونکہ خداوند عالم نے انہیں تعلیم دینے کے بعد اس کام کے لیے منتخب کیا ہے یہی "راسخون فی العلم" ہیں اور یہی قرآن کی تاویل سے واقف ہیں۔

یہ آیت اہل بیت "یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ) کے تعارف کے لیے نازل ہوئی ہے۔ عہد نبویؐ کے علاوہ وہ قیامت تک پنجتن پاک' اصحاب کساء میں سے حسین علیہ السلام کی نسل سے نو آئمہ معصومین ہوں گے کہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود معین فرمایا ہے۔ اور

مناسب موقعوں پر ان کا تذکرہ بھی کیا ہے اور انہیں آئمہ ہدیٰ ' مصابیح الدجی ' اہل ذکر اور راسخون فی العلم کے القاب سے نوازا ہے۔

یہ روایت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے شیعوں کے نزدیک متواتر اور صحیح ہے اہل سنت والجماعت کے بعض علماء و مفسرین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور اس آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ یہ آیت اہل بیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے بعض علماء کے اسماء مثال کے طور پر پیش ہیں=

(۱) امام ثعلبی نے تفسیر کبیر میں سورہ نحل کی اسی آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے۔

(۲) تفسیر طبری میں جلد ۱۴ صفحہ ۱۰۹۔

(۳) تفسیر آلوسی المسمی بہ روح المعانی جلد ۱۴ صفحہ ۱۳۴۔

(۴) تفسیر قرطبی جلد ۱۱ صفحہ ۲۷۲۔

(۵) ابن کثیر نے تفسیر القرآن کی جلد ۲ صفحہ ۵۷۔

(۶) تفسیر حاکم المسمی بہ شواہد التنزیل جلد ۱ صفحہ ۳۳۴۔

(۷) تفسیر تستری المسمی بہ احقاق الحق جلد ۳ صفحہ ۴۸۲۔

(۸) قندوزی حنفی کی ینابیع المودۃ صفحہ ۵۱ و صفحہ ۱۴۰۔

بعض سطحی علم رکھنے والے حضرات کہتے ہیں کہ اس آیت کے

ظاہری معنی سے اہل کتاب "یہود و نصاری" مراد ہیں۔ تو ان کے لیے اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس آیت سے مراد یہود و نصاریٰ نہیں ہے۔

اولاً

اس لیے کہ قرآن نے متعدد آیات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہود و نصاری نے خدا کے کلام میں تحریف کی اور اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہہ دیا کہ یہ خدا کی کتاب ہے' تاکہ اس سے کچھ قیمت حاصل کر سکیں۔ قرآن مجید ان لوگوں کے بارے میں کذب اور ان کے ہاتھوں سے کلام خدا تحریف کی گواہی دے رہا ہے یہ بات معقول نہیں ہے کہ قرآن ان کی اس ناپاک حرکت کی مذمت کرتے ہوئے ان سے رجوع کرنے کا حکم دے اور کہے کہ جو مسائل تم نہیں جانتے وہ یہود اور نصاریٰ سے پوچھ لو۔

ثانیاً

بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب الشہادات کے باب لا یسئل اہل الشرک کی جلد ۳ صفحہ ۲۳۷ پر ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ انہیں جھٹلاؤ یہ کہو ہم نے اللہ اور اس کے نازل کئے ہوئے پر ایمان لا چکے ہیں۔

اس آیت سے یہود و نصاریٰ کو چھوڑنا اور ان سے رجوع نہ کرنا آشکار ہے، کیونکہ عدم تصدیق و تکذیب ہی سوال کی نفی کر رہے ہیں کہ جس کا صحیح جواب طلب کیا جاتا ہے۔

ثالثا

بخاری نے اپنی صحیح کی جلد ۸ صفحہ ۲۰۸ کتاب التوحید ہیں اللہ تعالیٰ کے قول "كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ" کے باب میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ:

انہوں نے کہا اے مسلمانو! تم اہل کتاب سے کسی چیز کے بارے میں کیسے سوال کرتے ہو، جب کہ تمہاری کتاب وہ ہے جسے خدا نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا اور جو صرف اللہ کی طرف سے خبر دیتی ہے وہ کوئی قصیدہ نہیں ہے اور خدا تمہیں آگاہ کر چکا ہے، کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے کتاب خدا میں تحریف کر دی، اور پھر اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہنے لگے یہ خدا کی کتاب ہے، تاکہ اس سے کچھ نفع حاصل کر سکیں، یا تمہیں اس چیز کے بارے میں ان سے سوال کرنے کو منع کیا ہے، کہ جس کا تمہیں علم نہ ہو، خدا کی قسم ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ تم سے اس چیز کے بارے میں سوال کرے، جو تم پر نازل ہوئی۔

رابعا

اگر آج ہم اہل کتاب نصاریٰ سے سوال کریں تو وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ خدا ہیں اور یہود انہیں جھٹلاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ عیسیٰ کو نبی بھی نہیں مانتے ہیں اور یہود و نصاریٰ دونوں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کا انکار کرتے ہیں۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ محمد بہت بڑے جھوٹے اور دجال ہیں۔ نعوذ باللہ۔ کیا اس کے باوجود ہم آیت کا یہ مفہوم نکال سکتے ہیں کہ خدا نے ہمیں ان سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ نہیں نہیں بلکہ ناممکن ہے اور جب ظاہر آیت سے اہل کتاب یہود و نصاری کا اہل ذکر ہونا سمجھ میں آتا ہے تو اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی ہے کہ یہ آیت اہل بیت علیہم السلام نبی کی شان میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک صحیح حدیثوں سے ثابت ہے اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خداوند متعال نے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کتاب کے علم کا وارث (کہ جس میں کسی قسم کی تفریط نہیں ہے) بنایا ہے اور اپنے بندوں میں سے انہیں اس لیے منتخب کیا ہے تاکہ لوگ تفسیر و تاویل قرآن کے بارے میں ان سے رجوع کریں اور جب وہ خدا و رسولؐ کی اطاعت کریں گے تو ان کی ہدایت کی ضمانت بھی ہوگی۔

خداوند عالم چاہتا تھا کہ تمام لوگوں کو اپنے ان برگزیدہ اور عالم کتاب افراد کا مطیع و فرمانبردار بنا دے، تاکہ قیامت اور دنیا کے نظم و نسق کا مسئلہ

کتاب اللہ کے مطابق حل ہو جائے' پس اگر یہ برگزیدہ افراد لوگوں کے درمیان نہ رہیں گے تو ہر ایک پر ہوس اقتدار و ریاست طاری ہو جائے گی اور اس طرح لوگوں کے امور میں بد نظمی پیدا ہو جائے گی اور ہر ایک کے لیے اعلمیت کا دعویٰ کرنا ممکن ہو گا۔

اس مبحث کے اختتام پر حوض کوثر پر ایمان و ایقان رکھنے کی اہمیت پر کچھ تحریر کرنا ضروری ہے۔ حوض کوثر کے متعلق کثیر تعداد میں احادیث وارد ہوئی ہیں۔ صاحب حق الیقین نے وسیلہ لواء الحمد' حوض کوثر اور شفاعت والی احادیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ حوض کوثر پر ایمان و اعتقاد رکھنے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی حدیث کافی ہے جسے کتاب امالی اور عیون اخبار الرضا میں جناب امام رضا علیہ السلام سے اور انہوں نے اپنے آباؤ اجداد طاہرین کے سلسلہ سے جناب رسول خدا سے روایت کیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"من لم یومن بحوضی فلا اورده الله حوضی ومن لم یومن بشفاعتی فلا اناله الله شفاعتی"

"جو شخص میرے حوض پر ایمان نہ رکھے' خدا اسے میرے حوض پر وارد نہ کرے اور جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہ رکھے' خدا اسے شفاعت نصیب نہ کرے۔"

سورہ مبارکہ الکوثر میں جو انا عطینک الکوثر لفظ وارد ہے۔ اے رسول! ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا ہے اس کی تفسیر میں متعدد ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں کوثر کی تفسیر حوض کوثر سے کی گئی ہے۔ چونکہ کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "ابتر" (نسل بریدہ) کہتے تھے' خداوند عالم نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہم نے تمہیں اولاد کثیر عطا کی ہے' اسی لیے اکثر روایتوں میں اس کی تفسیر کثرت اولاد سے بھی کی گئی ہے۔ ابن عباس سے اس کی تفسیر "خیر کثیر" کے ساتھ کی گئی ہے اور بعض مفسرین نے "نبوت" اور بعض نے قرآن اور بعض نے شفاعت سے بھی اس کی تفسیر کی ہے۔

فی الحقیقت ان تمام تفاسیر میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ طبری نے اپنی تفسیر مجمع البیان جلد ۲ بذیل تفسیر کوثر یہ سب مختلف تفسیریں لکھنے کے بعد لکھا ہے=

"واللفظ محتمل للکل فیجب ان یحمل علی جمیع ماذکر من الاقوال فقد اعطاه الله سبحانه الخیر الکثیر و عده الخیر الکثیر فی الاخره و جمیع هذا الاقوال تفصیل الجملة التی هی الخیر الکثیر فی الدارین"

یعنی لفظ کوثر ان سب معانی کا متحمل ہے' لہٰذا واجب ہے کہ اسے ان تمام معانی پر حمل کیا جائے۔ چنانچہ خداوند عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

دنیا میں خیر کثیر عطا فرمایا اور آخرت میں بھی خیر کثیر عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے اور در حقیقت یہ سب اقوال خیر کثیر فی الدارین والے جملہ کی تفصیل ہیں۔

سورۂ کوثر کی شان نزول میں آیا ہے کہ عاص بن وائل (جو مشرکین کے سرداروں میں سے تھا) نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسجد الحرام سے نکلتے وقت ملاقات کی' اور کچھ دیر آپ سے باتیں کرتا رہا۔ قریش کے سرداروں کا ایک گروہ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا' انہوں نے دور سے اس منظر کا مشاہدہ کیا۔ جس وقت "عاص بن وائل" مسجد میں داخل ہوا تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ تو کس سے باتیں کر رہا تھا؟ اس نے کہا۔ اس "ابتر" شخص سے۔

اس نے اس تعبیر کا اس لیے انتخاب کیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند عبداللہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور عرب ایسے آدمی کو جس کا کوئی بیٹا نہ ہوا "ابتر" کہا کرتے تھے۔ یعنی (بلا عقب' مقطوع النسل) لہٰذا قریش نے حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند کی وفات کے بعد اس لقب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے انتخاب کر رکھا تھا۔ جس پر یہ سورہ نازل ہوئی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سی نعمتوں اور کوثر کی بشارت دی اور ان کے دشمنوں کو ابتر کہا (مجمع البیان جلد صفحہ ۵۶۹۔

تفسیر نمونہ جلد ۲۷ صفحہ ۳۱۹)

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بانوے اسلام جناب خدیجہ الکبری علیہا السلام کی بطن سے دو بیٹے تھے ایک قاسم اور دوسرے طاہر' جنہیں عبداللہ بھی کہتے تھے دونوں ہی مکہ میں دنیا سے چل بسے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی بیٹا نہ رہا اس بات نے قریش کی زبان کھول دی' اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "ابتر" کہنے لگے۔ قریش اپنی روایات کے مطابق بیٹے کو حد سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اسے باپ کے پروگراموں کو جاری رکھنے والا شمار کرتے تھے۔ اس سانحے کے باعث ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے پروگرام معطل ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ وہ اس بات پر بہت خوش تھے۔

قرآن مجید نازل ہوا' اور اس سورہ میں اعجاز آمیز طریقہ سے انہیں جواب دیا اور یہ خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہی ابتر رہیں گے' اور اسلام اور قرآن کا پروگرام کبھی منقطع نہیں ہو گا۔ اس سورہ میں جو بشارت دی گئی ہے وہ ایک طرف تو دشمنان اسلام کی امیدوں پر ایک ضرب تھی اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی خاطر تھی' جن کا قلب پاک اور نازک دل اس قبیح لقب اور

دشمنوں کی سازش کو سن کر غمگین اور مکدر رہوا تھا۔

حضرت علی علیہ السلام کے ساقی کوثر ہونے کا اثبات کتب فریقین کی بکثرت روایات سے ثابت ہے چنانچہ امالی شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا=

"اَنْتَ اَخِیْ وَ وَزِیْرِیْ وَ صَاحِبَ لِوَائِی فِیْ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ وَاَنْتَ صَاحِبَ حَوْضِی وَمَنْ اَحَبَّكَ اَحَبَّنِیْ وَ مَنْ اَبْغَضَكَ اَبْغَضَنِیْ"

"یاعلیؑ ! تم میرے بھائی' وزیر اور دنیا و آخرت میں میرے جھنڈے کے حامل ہو (دنیا میں آپ کا حامل علم جنگ ہونا تو واضح ہے اور آخرت میں حمل علم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لواء الحمد جو اتنا بڑا وسیع ہے کہ روز بروز قیامت تمام انبیاء و مرسلین اور ان کے اوصیاء اور کامل مومنین اسی کے زیر سایہ ہوں گے اس کے علاوہ محشر میں اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہوگا۔ جناب امیر کی یہ فضیلت بھی کتب فریقین میں ہے۔ ملاحظہ ہو مناقب شہر بن آشوب' ینابیع المودۃ ۔ ارجح المطالب وغیر) اور تم ہی میرے حوض کے ساقی ہو۔ تمہارا دوست میرا دوست اور تمہارا دشمن

میرا دشمن ہے۔ نیز اسی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی موجود ہے فرمایا:

”من ارادان یتخلص من ھول القیامة فلیتول ولی و لیتج وصی و خلیفتی من بعدی علی بن ابی طالب فانه صاحب حوضی یذور عنه اعدائه و لیسقی اولیائه فمن لم یسق منه لم عطشانا و لم یروابدا و من سقی منه شربته لم یشق ولم یظما ابدا“

”جو شخص قیامت کے ہولناک حالات سے نجات چاہتا ہے اسے چاہیے کہ میرے ولی سے دوستی رکھے‘ اور میرے وصی و خلیفہ جناب علی بن ابی طالب ؑ کی اتباع و پیروی کرے‘ کیونکہ یہی میرے حوض کے ساقی ہیں وہ اس سے دشمنوں کو دور ہٹائیں گے‘ اور اپنے دوستوں کو اس سے سیراب کریں گے‘ جو شخص اس سے نہیں پی سکے گا وہ ہمیشہ پیاسا رہے گا‘ اور کبھی سیراب نہیں ہوگا۔ اور جو شخص اس سے ایک مرتبہ پی لے گا‘ وہ نہ تکلیف اٹھائے گا اور نہ ہی اسے پھر پیاس لگے گی“۔ کتاب خصال شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا:

انا مع رسول الله و معی عترتی علی الحوض فمن ارادنا

فلیاخذ بقولنا و لیعمل بعملنا فان لکل اھل بیت نجیب ولنا شفاعۃ ولا ھل مودتنا شفاعته فتنا فسوا فی القاء نا علی الحوض فانا نذو دعنه اعدائنا و نسقی منه احبائنا و اولیائنا و من شرب شربته لم یظئما بعدھا ابداء" (الحدیث)

"میں حوض پر رسول خداؐ کے ساتھ ہوں گا اور میری عترت بھی وہاں میرے ساتھ ہوگی، پس جو شخص ہماری ملاقات کا خواہش مند ہے اسے چاہیے کہ ہمارے قول و فعل پر عمل کرے، کیونکہ ہر گھر سے کچھ نجیب و شریف ہوتے ہیں (جو ہماری کامل اتباع کرے گا وہ نجیب متصور ہوگا) ہمارے لیے اور ہمارے محبوں کے لیے شفاعت ثابت ہے، پس حوض پر ہم سے ملاقات کرنے کی کوشش کرو کیونکہ ہم وہاں سے اپنے دشمنوں کو دور ہٹائیں گے اور اپنے محبوں کو سیراب کریں گے جو شخص اس کا ایک گھونٹ پی لے گا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی۔"

ایسی احادیث سے شیعہ کتب حدیث مملوو مشحون ہیں۔ نیز برادران اسلامی کی کتب میں بھی بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن سے حضرت علی علیہ السلام کا ساقی کوثر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب ارجح المطالب، ینابیع المودۃ، مطالب السئول اور ارشاد و دیلمی وغیرہ کتب قابل ملاحظہ ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی یہ صفت اس قدر مسلّم ہے کہ آپ کا

لقب ہی "ساقی کوثر" مشہور ہو گیا' اور شعراء نے بھی جا بجا آپ کے حق میں اس لقب کو استعمال کیا ہے' اگر خوف طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو ہم یہاں مختلف شعراء کرام کا کچھ کلام بطور نمونہ پیش کرتے۔

صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۹ مطبوعہ دہلی نیز صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۴۵ مطبوعہ مجتبائی دہلی' کتاب الفتن میں بروایت ابی حازم مروی ہے وہ سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے۔

"سمعت النبی یقول انا فرطکم علی الحوض من ورده شرب منه و من شرب منه لم یظما ابدا ولیرون علی اقوام اعرفهم و یعرفونی ثم یحال بینی و بینهم اللهم منی یقال انک لاتدری مابدلوا (احدثوا) بعدک فاقول سحقا سحقا لمن بدل بعدی"

یعنی میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا وہ فرما رہے تھے کہ میں تم سے پہلے حوض کوثر پر موجود ہوں گا جو شخص وہاں پہنچے گا وہ اس سے پیئے گا اور جو پیئے گا وہ ہرگز پیاسا نہ ہو گا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ وارد ہوں گے جنہیں میں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ پھر یکایک ان کے اور میرے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا (الی ان قال) اس وقت میں کہوں گا کہ یہ میری جماعت سے تھے؟ جواب میں

کہا جائے گا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا عمل کیۓ؟ تب میں کہوں گا دوری اور ہلاکت ہو اس شخص کے لیے جس نے میرے بعد میرے دین میں تغیر و تبدل کیا"۔ اس مضمون کی بخاری و مسلم میں کئی روایتیں موجود ہیں۔ بعض میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ جب انہیں دور ہٹایا جائے گا تو میں کہوں گا "یا رب اصحابی اصحابی" یا اللہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ فیقال لا تدری مااحد ثوابعدک صفحہ ۹۷۴ بخاری جلد ۲ مطبوعہ دہلی۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا احداث و بدعات پھیلائے۔؟

اسی طرح مسلم مع شرح نودی جلد ۲ صفحہ ۲۴۹ و بخاری جلد ۹۷۵ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"انی علی الحوض حتی انظر من یرد علی منکم و سیئوخذاناس من دونی فاقول یا رب منی و من امتی فیقال اماشعرت ما عملوا بعدک واللہ مابر جوا بعدک یرجعون علی اعقابھم"

"یعنی میں حوض کوثر پر موجود ہوں گا تاکہ دیکھوں کہ تم میں سے کون لوگ میرے پاس پہنچتے ہیں اس اثناء میں میرے سامنے سے کچھ لوگوں کو پکڑ لیا جائے گا میں کہوں گا یااللہ یہ تو میرے آدمی ہیں، جواب میں

کہا جائے گا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا عمل کئے؟ بخدا آپ کے بعد یہ اپنے پچھلے پاؤں پلٹ گئے تھے" بخاری کی اس صفحہ پر ایک حدیث کا تتمہ ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے۔ "ارتدوا بعدک علی ادبارھم القھقری" یعنی کہ یہ لوگ تمہارے بعد بالکل مرتد ہو گئے تھے۔

نووی نے شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۹ طبع دہلی میں کہا ہے۔

قال القاضی عیاض احادیث الحوض صحیحة والایمان به فرض والتصدیق به من الایمان وھو علی ظاھره عند اھل السنة والجماعت بلا تاویل ولا یختلف فیه و یقال القاضی حدیثه متواتر النقل رواه خلائق من الصحابه"

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث حوض صحیح اور متواتر ہیں۔ انہیں بہت سے صحابہ نے نقل کیا ہے لہٰذا ان پر بلا تاویل ایمان لانا فرض ہے۔

لمحہ فکریہ

ان احادیث سے ضیاء الرحمٰن فاروقی اور ان کے پیرو سپاہ صحابہ کے بہت سے مزعومہ مسلمات کے قصر مسمار ہو کر رہ جاتے ہیں' اور وہابیوں کے بنائے ہوئے کئی ایک جعلی احادیث سے دجل و فریب اور وضع و جعل کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ جیسے اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتھم

اھتدیتم اور الصحابة کلھم عدول" وغیرہ وغیرہ کیونکہ بنص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کئی صحابہ یقیناً جہنمی ہیں تو پھر یہ عمومی نظریہ کہ سب صحابہ عادل ہیں اور سب کی اتباع موجب دخول جنت اور باعث رشد و ہدایت ہے کسی طرح بھی درست اور قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ ظاہر ہے کہ جو خود جہنمی اور راہ گم کردہ ہو وہ دوسروں کو کس طرح راہ راست کی ہدایت کر کے جنت میں پہنچا سکتا ہے۔

اگرچہ ان احادیث میں ان جہنمیوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ یہ وہی اصحاب ہوں گے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین اسلام میں اپنی رائے و قیاس سے تغیر و تبدل کئے ہوں گے۔ لہٰذا طالبان تحقیق حق آئینہ سیرو تواریخ میں باآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ صحابہ رسولؐ میں سے ایسے لوگ کون تھے جنہوں نے اپنے اجتہادات سے دین میں بدعات و احداث پھیلائے؟ اس سلسلہ میں تاریخ الخلفاء سیوطی کے باب اولیات اور الفاروق شبلی وغیرہ کتب سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ تاہم مزید وضاحت کے لیے ایک دو روائتیں ان کی تشخیص کے لیے پیش کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ثقلین یعنی قرآن و عترت کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اور ان کی حرمت و عزت کا کچھ بھی پاس و لحاظ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ حق الیقین علامہ شبیر میں بروایت ابوذر غفاری

رضوان اللہ علیہ ایک طویل حدیث مذکور ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حوض کوثر پر مختلف لوگ وارد ہوں گے اور آپؐ ان سے برابر یہی سوال کریں گے کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ مختلف حضرات جو مختلف جواب دیں گے وہ یہ ہوں گے۔

"کذبنا الاکبرو مزقناہ و اضطھدنا الاصغر و ابتر زناہ فقد کذبنا الاکبر مزقناہ و قلقلنا الاصغر و قتلناہ کذبنا الاکبر و عصیناہ و خذلنا الاصغر و خذلناہ"

"ہم نے ثقل اکبر کو جھٹلایا اور اس کے ٹکڑے کئے اور اس کی نافرمانی کی اور ثقل اصغر کو کمزور کیا۔ اس کے حق کو غصب کیا اس سے جنگ کی اور اسے قتل کیا۔ حکم رسولؐ ہوگا کہ ان سب کو جہنم میں جھونک دو۔ اس کے بعد ایک اور گروہ کا دور ہوگا' ان سے بھی سوال کیا جائے گا وہ جواب میں عرض کریں گے۔ "اتبعنا الکبر و صدقناہ و ازدنا الاصغر و وقتلنا معہ" ہم نے ثقل اکبر کی اتباع اور اس کی تصدیق کی اور ثقل اصغر کی نصرت و اعانت کی اور اس کی حمایت میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ارشاد ہوگا۔ سیر ہو کر پیو۔ اس وقت ان کے امام (علی علیہ السلام) کا نور شمس طالعہ کی طرح لامع

وساطع ہوگا اور ان مومنین کے چہرے بدر منیر کی طرح روشن و درخشاں ہوں گے۔

کنزل العمال جلد ۲ صفحہ باب الفتن حدیث نمبر۸۲۱ میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن قرآن و عترت بارگاہ الٰہی میں امت کی بد سلوکی کاان الفاظ میں شکوہ کریں گے۔ قرآن کہے گا۔ یا رب حرقوفی و مذقونی یا اللہ لوگوں نے مجھے جلایا تھا اور میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے۔ عترت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوں فریاد کرے گی۔ یا رب طردونا و قتلونا و شردونا یااللہ! ان لوگوں نے ہمیں جلا وطن کیا۔ ہمیں قتل کیا اور ہمیں متفرق کیا۔ (رواہ احمد فی المسند البرانی فی الکبیر) و یقول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا رب ان قوی اتخذوا ھذا القران مھجورا بارالٰہی ان لوگوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ (قرآن کریم)

طالبان تحقیق کے لیے ان لوگوں کا معلوم کرنا مشکل نہیں جنہوں نے قرآن و عترت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یہ سلوک کیا اور نہ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟ یا کس مذہب کے پیشوا تھے؟

معروف محقق ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی اپنی کتاب تجلی میں لکھتے ہیں:

"یہ وہ باتیں ہیں جن کو سنی ہونے کے ناطہ علمائے اہل سنت سے جانتا ہوں اور صحابہ کی تقسیم بندی کی باتیں میں نے علماء شیعہ سے سنی ہیں۔"

یہی وجہ تھی کہ میں نے سوچا' اصحاب کے سلسلے میں اپنی بحث کا آغاز گہری تحقیق کے ساتھ شروع کروں اور میں نے اپنے خدا سے وعدہ کیا کہ اگر اس نے میری رہنمائی کی تو میں ہر جذبہ و احساس سے فانی ہو کر دونوں گروہوں کی باتیں غیر جانبدارانہ سنوں اور ان میں جو باتیں بہترین ہوں ان کی پیروی کروں اور اس سلسلے میں اعتماد دو چیزوں پر ہے۔

1۔ منطق

پس میں ان منقولات کے سوا کسی چیز پر اعتماد نہیں کروں گا جن پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ خصوصاً قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں اور احادیث صحیحہ کے معاملے میں۔

2۔ عقل

کیونکہ عقل انسان کے لیے اللہ کی بہترین نعمتوں میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے انسان کو جملہ مخلوقات پر برتری اور بزرگی بخشی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس وقت اپنے بندوں سے احتجاج کرتا

ہے انہیں عقل سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"کیا لوگ عقل نہیں رکھتے؟

کیا لوگ غور نہیں کرتے؟

کیا لوگ سوچتے نہیں؟

کیا لوگ دیکھتے نہیں؟" وغیرہ۔

بنا براین عملی صورت یہ ہے کہ میرا اسلام عبارت ہے' اللہ پر ایمان ' اس کے فرشتوں پر ایمان' اس کی کتابوں پر ایمان اور اس کے رسولوں پر ایمان سے اور اس بات پر ایمان سے کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں اور دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

یہ حقیر اس معاملے میں کسی بھی صحابی پر تکیہ نہیں کرنا چاہتا وہ اپنے مقام و منزلت میں کتنے ہی اونچے ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی قرابت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ پس میں نہ اموی ہوں' نہ عباسی' نہ فاطمی' میں نہ سنی ہوں' نہ شیعہ میں ابوبکر سے کوئی دشمنی رکھتا ہوں اور نہ عمر سے' عثمان سے نہ علیؑ سے۔ حتی کہ سیدنا حمزہ کے قاتل وحشی سے بھی کوئی دشمنی نہیں رکھتا' کیونکہ حبشی بھی بالآخر اسلام لائے اور اسلام ماضی کے گناہ کو ختم کر دیتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کو معاف کر دیا تھا۔

اب جبکہ میں اس بحث میں پڑتا ہوں' اپنے آپ کو بکمال اخلاص

خالی الذہن کرتا ہوں اور اپنے تمام گزشتہ افکار و عقائد سے دست کش ہوتا ہوں تاکہ حقیقت تک پہنچ جاؤں۔ پس انشاء اللہ میں اپنی بات "اصحاب" کے مختلف موقف سے شروع کرتا ہوں۔

اصحاب صلح حدیبیہ میں

قصے کا خلاصہ

ہجرت کے چھٹے سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ ادا کرنے کی غرض سے اپنے ایک ہزار چار سو اصحاب کے ہمراہ نکلے۔ آپ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی تلواریں اپنی کمر سے لٹکا رکھیں۔ آپ کے اصحاب نے "ذوالحلیفہ" میں احرام باندھ لیا' اور قربانی کے جانوروں کے گلے میں پٹے باندھ دیئے' تاکہ قریش جان لیں کہ آپ عمرہ کی غرض سے آئے ہیں اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن قریش کے دلوں میں تکبر تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اہل عرب یہ سنیں گے کہ محمدؐ زبردستی مکہ میں وارد ہوئے ہیں' اور انہوں نے قریش کی طاقت و شوکت کا جنازہ نکال دیا ہے' تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ لہٰذا انہوں نے سہیل بن عمرو بن عبدود عامری کی قیادت میں کچھ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا۔ جنہوں نے یہ درخواست کی کہ اس بار آپؐ جس راہ آئے ہیں اسی راہ واپس چلے جائیں۔ یہ درخواست مشروط تھی اس بات کے ساتھ کہ آئندہ سال دو تین دن مکہ کو آپ کے اختیار میں دے دیں گے' ساتھ ہی ساتھ قریش نے کچھ دشوار نوعیت کی شرطیں بھی رکھیں جن کو رسول اللہ

ﷺ نے منظور کیا کیونکہ اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ ؐ کو آگاہ کیا تھا۔

لیکن بعض اصحاب نے رسول اللہ ﷺ کے اس رویئے کو پسند نہیں کیا اور شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔

عمر بن خطاب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے عرض کیا۔

"کیا آپ واقعی خدا کے نبی ؐ نہیں ہیں؟"

آپ نے فرمایا "ہاں! نبی ؐ ہوں"

عمر نے کہا "کیا ہم حق پر اور دشمن باطل پر نہیں ہے"

آپ نے فرمایا "ہاں!"

عمر نے کہا "تو ہم کیوں اپنے دین کو ذلیل کریں؟"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں خدا کا نبی ہوں اور ہرگز خدا کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ وہ ہمارا حامی و ناصر ہے۔"

عمر نے کہا "کیا آپ ؐ نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم خانہ کعبہ میں پہنچیں گے اور طواف کریں گے؟"

آپ نے فرمایا "ہاں! کیا میں نے تمہیں خبر دی کہ ہم آئندہ سال آئیں گے؟"

عمر نے کہا "نہیں"

آپؐ نے فرمایا "تم آئندہ سال آؤ گے اور طواف کرو گے"

اس کے بعد عمر، ابوبکر کے پاس گئے اور انہوں نے کہا:

"اے ابوبکر! کیا یہ واقعی نبی نہیں ہیں؟"

انہوں نے کہا "کیوں نہیں؟ بے شک ہیں"

اس پر عمر نے وہی سوالات جو رسول اللہ ﷺ سے کئے تھے۔ ابوبکر سے کیے اور ابوبکر نے وہی جواب دیئے اور کہا "یہ بے شک اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور خدا ان کی تائید کرتا ہے پس تم ان کی نافرمانی سے باز آؤ اور ان کی فرمانبرداری کرو۔"

اور رسول اللہ ﷺ صلح نامے سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا۔

"اٹھو قربانی کرو اور سر منڈواؤ"

مگر خدا کی قسم! ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے اس حکم کو تین بار دھرایا۔ جب کسی نے بھی اس حکم کی اطاعت نہیں کی تو آپ اپنے خیمے میں گئے۔ پھر باہر آئے اور ان میں سے کسی سے کوئی بات کیے بغیر اپنے ہاتھ سے اونٹ کی قربان کی اس کے بعد آپؐ نے اپنے حجام کو پکارا کہ وہ آپؐ کا سر مونڈے۔ جب اصحاب نے یہ صورتحال دیکھی

تو اٹھے۔ انہوں نے قربان کی اور انہوں نے ایک دوسرے کا سر مونڈا۔ اور قریب تھا کہ بعض لوگ بعض لوگوں کو قتل کر دیتے۔

یہ صلح حدیبیہ کے قصے کا خلاصہ ہے۔ اور یہ وہ روئداد ہے جس پر شیعہ اور سنی دونوں متفق ہیں۔ (اس قصے کو ارباب سیرو تاریخ نے نقل کیا ہے بخاری بھی اسے صحیح میں کتاب شروط باب الجہاد جلد صفحہ ۱۲۲ میں لائے ہیں۔) صحیح مسلم جلد ۲ باب صلح حدیبیہ میں بھی یہ واقعہ موجود ہے)

طبری ' ابن اثیر اور ابن سعد جیسے سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں نے اور بخاری و مسلم کی قبیل کے دوسرے لوگوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس مقام پر اپنے قارئین کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ میں اور آپ مل کر تامل کریں۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ میں یہ پڑھوں کہ اصحاب نے رسول کے معاملے میں یہ رویہ اختیار کیا اور سرسری گزر جاؤں۔

اس قصے کو پڑھ کر کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو تسلیم کرے گا کہ اصحاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ کے احکام کی سیدھے سیدھے اطاعت کرتے تھے اور ان کے احکام پر بے چون و چرا عمل پیرا تھے۔؟

یہ قصہ ان کی تکذیب کرتا ہے اور ان کی قلعی کھول دیتا ہے۔ کیا کوئی صاحب عقل و خرد یہ تصور کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کا یہ طرز عمل ایک معمولی بات ہے یا قابل قبول ہے یا قابل معافی ہے؟

خداوند کریم قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ:

"فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما"

نہیں، قسم تمہارے رب کی! یہ لوگ اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتے جب تک کہ تمہیں اپنے اختلافات میں حکم قرار دیں، پھر تم جو فیصلہ کرو اس پر اپنے دل میں کچھ ملال محسوس نہ کریں اور بے چوں و چرا تمہارے حکم کو تسلیم کرلیں۔ (سورۂ النساء آیت ٦٥)

کیا عمر بن خطاب نے اس موقع پر حکم رسولؐ کو حیل و حجت اور دل تنگ ہوئے بغیر مان لیا تھا؟ یا یہ کہ ان کے دل میں شک و تردد موجود تھا؟ خصوصاً اس وقت جب انہوں نے کہا، کیا واقعی رسولؐ نہیں ہیں؟" کیا آپ نے ایسا نہیں کہا تھا؟ اور جب رسول اللہ نے تسلی بخش جواب دے دیا تو کیا وہ اس کے بعد خاموش ہوگئے؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ وہ ابوبکر کے پاس گئے اور وہی سوالات ان سے کیے۔

پھر جب ابوبکر نے جواب دیا اور انہیں نصیحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت کریں تو کیا وہ خاموش ہوگئے؟ میں نہیں جانتا۔ شاید ہوگئے ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا ابوبکر کے جواب سے مطمئن ہوگئے ہوں ورنہ

کیوں اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

"پس میں نے اس سلسلے میں کچھ کام انجام دیئے ہیں۔"

اب خدا جانے اور اللہ کے رسول ؐ کو معلوم کہ وہ کون سے کام تھے جو انہوں نے انجام دیئے پس اتنا معلوم ہے کہ باقی صحابہ نے بھی اس واقع کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر کان نہیں دھرا حالانکہ آپ نے تین بار اپنا حکم دھرایا۔

اف میرے خدایا! یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو اس طرح پس پشت ڈال دیں؟

اگر یہ بات صرف شیعہ روایات میں ہوتی تو میں اسے ہرگز نہ مانتا بلکہ اسے اصحاب پر تہمت شمار کرتا، لیکن یہ بات اس قدر مشہور ہے کہ تمام محدثین اہل سنت نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور چونکہ میں نے اپنے تئیں عہد کیا ہے کہ جو روایات متفق فی الفریقین ہو گئیں اسے قبول کروں گا۔ اس واسطے عین اس حالت میں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اسے تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

اور میں کیا کہہ سکتا ہوں اور ان اصحاب کی طرف سے کیونکر معذرت طلب کرسکتا ہوں جنہوں نے روز بعثت سے لے کر حدیبیہ تک تقریباً بیس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گزارے اور نبوت کے تمام تر

معجزات کھلی آنکھوں سے دیکھے اور قرآن انہیں شبانہ روز یہ بات یاد دلاتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں کس ادب کے ساتھ رہیں اور کس طرح آپؐ سے بات کریں۔ یہاں تک کہ انہیں تنبیہہ کی کہ اگر وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آواز سے زیادہ اونچی آواز نکالیں گے تو ان کے سب اعمال اکارت جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ عمر بن خطاب نے دیگر صحابہ کے دلوں میں وسوسے پیدا کئے جبھی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بات سنی ان سنی کر دی اور خود عمر بن خطاب اقرار کرتے ہیں۔

"انہوں نے کچھ ایسے کام کئے ہیں کہ ان کا ذکر ہیں کرنا چاہتے۔"

اور اس بارے میں یہ بات ملتی ہے کہ وہ بار بار کہتے تھے۔

"میں نے اس قدر روزے رکھے، صدقے دیئے نمازیں پڑھیں اور غلام آزاد کئے تاکہ اس بات کی تلافی ہو جائے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے روبرو کہی تھی۔ (الخ)

اس سلسلے میں پورا واقعہ ان سے منقول ہے۔ (سیرت حلبیہ باب صلح حدیبیہ جلد ۲ صفحہ ۷۰۶) یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ خود عمر نے بھی اپنے غلط رویئے کو اسی روز محسوس کرلیا تھا اور مجھے اس کا یقین اس لیے ہے کہ قیل و قال نہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں بند ایک حقیقت ہے۔

اصحاب اور واقعہ قرطاس و قلم

کتف "شانے کی ہڈی" کو قرطاس لکھا گیا ہے۔ اس داستان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

اصحابہ' رسول اللہ ﷺ کی رحلت سے تین روز قبل آپ ﷺ کے گھر میں اکٹھے ہوئے تھے' تب آپؐ نے یہ خواہش فرمائی کہ کاغذ اور قلم لایا جائے تاکہ میں ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ لوگ ہمیشہ کے لیے گمراہی سے بچ جائیں۔ لیکن بعض اصحاب نے آپؐ کی خواہش کا احترام نہیں کیا اور انہوں نے آپؐ پر ہذیان گوئی کی تہمت لگائی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ برہم ہوئے اور آپؐ نے ان لوگوں کو اپنے گھر سے نکال دیا۔

اس داستان کو قدرے تفصیل سے سنئے۔!

ابن عباس نے کہا۔ جمعرات کا دن' کیسا دن تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا درد شدید ہو گیا تھا۔

آپ نے فرمایا "آؤ! میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ

میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو سکو۔"

عمر نے کہا "رسول اللہ ﷺ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے۔ پس ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔"

اہل کتاب نے عمر سے اختلاف کیا تو لوگ باہم جھگڑا کرنے لگے۔ کچھ لوگ کہتے تھے چلو' رسول اللہ ﷺ کو تحریر لکھنے دو تاکہ اس کے بعد گمراہی سے بچا جاسکے۔ اور کچھ لوگ عمر کی بات دہرا رہے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں دھینگا مشتی زیادہ ہوئی تو آپؐ نے فرمایا۔

"اٹھو اور میرے پاس سے چلے جاؤ۔"

اس طرح ابن عباس برابر کہا کرتے تھے' سب سے بڑی مصیبت تو جمعرات کی مصیبت تھی جب لوگوں نے داتن کلکل کے سبب رسول اللہ ﷺ کو تحریر نہیں لکھنے دی۔ برادران اہل سنت کی معتبر کتابوں کے حوالہ جات درج ذیل ہیں۔

(صحیح بخاری جلد ۲ باب قول المریض "قوموا عنی")

صحیح مسلم جلد ۵ صفحہ ۷۵ کتاب الوصیتہ کے آخر میں)

(مسند امام احمد حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۵۵ اور جلد ۵ صفحہ ۱۱۶)

(تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۹۳)

تاریخ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۲۰)

یہ روح فرسا واقعہ بالکل صحیح ہے کیونکہ شیعہ علماء اور محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں سے نقل کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کہتے ہیں کہ یہاں بھی میں اپنے عہد کے مطابق جس کا ذکر کر چکا ہوں' اس راویت کو قبول کرتا ہوں اور دانتوں تلے انگلی دابے' عمر بن خطاب کے موقف کی توجیہ کے معاملے میں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے بارے میں اختیار کیا تامل سے کام لیتا ہوں اور یہ حکم کیا تھا؟ گمراہی سے امت کے تحفظ کا حکم! بلاشبہ اس تحریر میں مسلمانوں کے لیے کوئی نئی چیز ہوتی جو ان کے ہر شک و شبہ کو دور کر دیتی۔

مجھے شیعوں کی اس بات سے کوئی سروکار نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس تحریر کے ذریعہ علیؑ کو اپنا خلیفہ نامزد کرنا چاہتے تھے اور چونکہ عمر اس بات کو بھانپ گئے تھے لہٰذا مقابلے پر اتر آئے۔" شاید شیعہ ہمیں اپنے اس دعوے سے مطمئن نہ کر سکیں لیکن کیا ہم اس دردناک واقعے کی معقول توجیہ کر سکتے ہیں جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر غضبناک کر دیا کہ آپ نے لوگوں کو اپنے گھر سے نکال دیا اور ابن عباس کو اس قدر رلایا کہ ان کے آنسوؤں سے سنگریزے بھیگ گئے اور انہوں نے اس کو سب سے بڑی مصیبت تصور کیا۔

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں' کہ عمر نے رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی شدت کو محسوس کیا' لہٰذا انہوں نے دلسوزی سے کام لیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ بے آرام ہوں۔

اس تجزیئے کو تو سادہ لوح افراد بھی قبول نہیں کرتے' اہل دانش کیا قبول کریں گے؟ اور میں نے بارہا کوشش کی کہ عمر کے لیے کوئی عذر ڈھونڈ نکالوں' لیکن واقعہ کی حقیقت نے مجھے اجازت نہیں دی کہ اگر "ہذیان بکتے ہیں" کو (العیاذ باللہ) (درد نے ان پر غلبہ کیا) سے بدل بھی دیں' تب بھی عمر کی اس بات کی تاویل تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے' کہ "تمہارے پاس قرآن ہے اور قرآن ہمارے لیے کافی ہے۔" کیا وہ رسول اللہ ﷺ سے کہ جن پر قرآن نازل ہوا زیادہ بہتر طور پر قرآن جانتے تھے؟ یا یہ کہ رسول اللہ ﷺ یہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں؟ (حاشا اللہ) یا یہ کہ آپ اس کام کے ذریعے لوگوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا چاہتے تھے؟ (استغفر اللہ)

اور اگر اہل سنت کی یہ توجیہ صحیح ہے تو پھر قطعی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ عمر کے اس حسن نیت سے باخبر تھے' اور بجائے اس کے کہ ان پر غصے ہوں اور فرمائیں "میرے پاس سے اٹھ جاؤ" آپ ان کا شکریہ ادا کرتے اور انہیں قریب بلاتے۔

کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ تو لوگوں نے کیوں آپ کی اطاعت کی؟ اس وقت یہ کیوں نہیں کہا کہ "حضرت ہذیان بکتے ہیں؟" کیا یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ ان کی تدبیر کارگر ہو چکی تھی' رسول اللہ ﷺ وصیت نہ لکھ سکے تھے اور اب وہاں ٹھہرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی؟

رہی یہ بات کہ لوگوں نے شور و غل کیا اور رسول اللہ ﷺ کے حضور میں رہتے ہوئے اختلاف کیا اور دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ جن میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو وصیت لکھنے دو' اور دوسرا گروہ عمر کی حمایت کرتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قصہ سادہ نہیں تھا اور اس کا تعلق صرف عمر سے نہیں تھا۔ اگر اتنی سی بات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ یہ کہہ کر عمر کو مطمئن کر دیتے کہ "میں ہرگز نفس کی خواہش پر بات نہیں کرتا" اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ امت کی ہدایت کے معاملے میں آپ پر درد کا غلبہ ہو؟ لیکن مقصد عمر کے اس قول کے بعد کچھ اور نوعیت ہی سامنے آئی' اور معلوم ہوا کہ پہلے ہی لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا اور اسکیم بن چکی تھی۔ البتہ اس سارے ہنگامے میں انہوں نے خداوند تعالیٰ کی اس بات کو فراموش کر دیا کہ:

اے مومنو! اپنی آوازوں کو پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو۔ جس

طرح تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ زور سے بولتے ہو اس طرح ان کے روبرو نہ بولا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ (سورہ حجرات آیت ۲)

لیکن یہاں اس واقعہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور اونچی آواز اور زیادہ اونچی ہوئی اور خاکم بدہن آپ پر "ہذیان گوئی" کی تہمت لگائی گئی اور لوگوں کی چلاہٹ کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں زبانی کشمکش برپا ہو گئی۔

میں قریب قریب یقین رکھتا ہوں کہ بیشتر حاضرین جو مجلس میں تھے، عمر کی بات دہرا رہے تھے۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ تحریر لکھنے کا کوئی فائدہ مرتب نہیں ہو گا۔ کیونکہ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ آپ کا احترام نہیں کرتے اور آپ کے بارے میں حکم کی اطاعت نہیں کرتے کہ اس نے آپ کے روبرو اونچی آواز سے بات کرنے کو منع کیا ہے اور یہ لوگ جو امر الٰہی کے بالمقابل سرکشی اور نافرمانی کر رہے تھے آپ کی تحریر کو بھی نہیں مانیں گے۔

اس طرح حکمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضا تھا کہ ان کے واسطے کوئی تحریر نہ لکھیں کیونکہ جس وقت آپ زندہ تھے۔ انہوں نے آپ کی طرف التفات نہیں کیا تو وہ وفات کے بعد کس طرح اس پر عمل کریں گے؟ بلکہ

سرکشی کرتے ہوئے کہیں گے۔ چونکہ آپ ؐ حالت ہذیان میں تھے اس لیے آپ کے کچھ احکام جنہیں آپ نے حالت مرض میں بیان کیا ہے۔ قابل رد ہیں کیونکہ آپ ؐ کی ہذیان گوئی پر ان کا یقین ثابت تھا۔

اے خدا! میں تیرے رسول ؐ عالی مقام کے حضور میں ایسی گستاخی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے آپ کو کس طرح تسلی دوں؟ اپنے نفس کو کس طرح مطمئن کروں؟ اپنے ضمیر کو کیونکر سمجھاؤں کہ عمر بن خطاب کوئی غرض و غایت نہیں رکھتے تھے۔ اور غیر ارادی طور پر یہ بات کہہ گئے تھے۔ در آن حالیکہ آپ کے بعض اصحاب نے جو آپ کے حضور میں حاضر تھے اس مصیبت پر گریہ کیا یہاں تک کہ سنگریزے ان کے آنسوؤں سے تر ہوگئے اور اس دن کا نام زریتہ المسلمین (مسلمانوں کی بدقسمتی) رکھا اور اس لیے میں اس سلسلے میں تمام توجیہات کو رد کرتا ہوں۔

میں چاہتا تھا کہ اس قصے کا سرے سے ہی انکار کر دوں تاکہ اس کی مصیبت سے چھٹکارا پاؤں مگر کیا کروں کہ صحاح کی کتابوں نے اس کو نقل کیا ہے اور اس کو درست جانا ہے مگر انہوں نے اس کی توجیہ نہیں کی ہے۔ لہٰذا اس واقعہ کی وضاحت کے سلسلے میں شیعوں نے جو کچھ کہا ہے قریب ہے کہ اس کو قبول کرلوں۔ کیونکہ ان کا تجزیہ منطقی ہے۔ اور اس معاملے میں ان کی

تائید کے قرائن زیادہ ہیں۔

آقائے باقر صدر سے اس معاملے میں جو کچھ میں نے پوچھا تھا اس کا جواب ہنوز میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میں نے کہا تھا۔ آپ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیؑ کی خلافت کے بارے کچھ تحریر کرنا چاہتے تھے۔ یہ بتایئے کہ تمام اصحاب میں سے سیدنا عمر نے آخر یہ کس طرح سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا لکھوائیں گے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ بات ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔

آقائے صدر نے جواب دیا تھا۔ نہ صرف عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادے سے باخبر تھے بلکہ حاضرین میں سے بیشتر لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کیونکہ اس سے قبل آپ یہ فرما چکے تھے۔

"میں تمہارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور میرے عترت' میرے اہل بیتؑ ۔ پس اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔"

"انی مخلف فیکم الثقلین ۔ کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی ابدا" (جامع ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

اور اب مرض الموت میں بھی یہی فرما رہے تھے کہ "آؤ میں تمہیں

ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ تم بعد میں کبھی بے راہ نہ ہوسکو۔"

"ھلم اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ ابدا"

حاضرین سمجھ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ غدیر خم میں کہا تھا اسی کو لکھنا چاہتے تھے تاکہ اس کی مزید تاکید ہو جائے اور وہ اللہ کی کتاب اور آپ کی عترت سے وابستگی کا حکم ہے اور عترت کے سربراہ بلاشبہ علیؑ ہیں۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرمانا چاہتے تھے "تم پر قرآن اور علیؑ کی پیروی لازم" اور اس سے مماثل بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیگر کئی مواقع پر بھی کہی تھی جیسا کہ محدثین نے ذکر کیا ہے۔

نیز یہ کہ قریش کے اکثر لوگ علیؑ کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ کم سن تھے۔ انہوں نے ان کا غرور توڑا تھا' ان کی ناک رگڑوائی تھی اور ان کے بڑے بڑے پہلوانوں اور سورماؤں کو قتل کیا تھا۔ لیکن انہیں جرات نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اس حد تک جسارت کریں جس حد تک ان کی جسارت صلح حدیبیہ کے موقع پر سامنے آئی۔ نیز جس حد تک شدید مخالفت اس وقت سامنے آئی جب آپؐ نے عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ ادا کی۔ پھر دیگر مواقع پر مخالفتیں کیں' جیسا کہ تاریخ میں لکھا ہے۔ یہ واقعہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اور آپ خود دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریر کے مقابلے میں مخالفت نے لوگوں کے اندر ایسی جرات پیدا کی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روبرو بد نظمی کا مظاہرہ کیا۔

عمر کا لوگوں سے یہ کہنا کہ ”ہمارے پاس قرآن ہے اور قرآن ہمارے لیے کافی ہے“ حدیث کے مشتملات کے برعکس ہے۔ جس میں قرآن و عترت کے ساتھ وابستگی کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ”خدا کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے اور وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ پس ہمیں عترت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ان کے اس قول کی کوئی معقول توجیہ سوائے اس کے نہیں کی جاسکتی کہ صرف اللہ کی اطاعت کی جائے‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے اور یہ توجیہ باطل اور غیر معقول ہے۔

اگر میں تعصب اور جانبداری سے کام نہ لوں بلکہ عقل سلیم اور آزاد فکر کو حاکم قرار دوں تو پہلی توجیہ کو قبول کروں گا اور یہ آسان ہے بہ نسبت اس بات کے کہ عمر کو الزام دوں کہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے حسبنا کتاب اللہ کہہ کر سنت کو رد کیا۔

اور اگر بعض حکمرانوں نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روگردانی کی اور کہا کہ اس میں تناقضات بہت ہیں تو انہوں نے تاریخ اسلام کے اس واقعے کی مثال دی ہے باوجود یہ کہ میں عمر کو اس واقعے کا اور امت کو ہدایت

سے محروم کرنے کا تنہا ذمہ دار نہیں سمجھتا اور اگر میں عمر کے حق میں انصاف سے کام لوں تو ان کو بھی اور ان اصحاب کو بھی برابر کا ذمہ ڈار ٹھہراؤں گا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت میں اس کا ساتھ دیا۔

مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اس واقعے کو پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ حالانکہ ابن عباس اس واقعے کو ایک بہت بڑی مصیبت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت مجھے ان لوگوں پر ہوتی ہے جو ایک نبی کی عزت کا دفاع نہیں کرتے اور نبوت کے بجائے صحابیت کا تحفظ کرتے ہیں۔ وہ صحابی کی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کی دھن میں اسلام اور رسول اسلام کی عزت و وقار کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب ہم اس واقعے کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے تو حقیقت سے راہ فرار کیوں اختیار کرتے ہیں اور اسے چھپانا کیوں چاہتے ہیں؟ کیوں اس بات کا اقرار نہیں کرتے کہ اصحاب بھی ہماری طرح ہی بشر ہیں۔ ان کی بھی خواہشات ہوتی ہیں' رجحانات ہوتے ہیں اور ان کے بھی اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ وہ بھی غلطی کرتے ہیں اور صحیح راہ پر چلتے ہیں۔

اور ہمارا تعجب اس وقت دور ہو جاتا ہے جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں جو ہمارے لیے انبیاءؑ علیہم السلام کی داستانیں بیان کرتا ہے کہ ان کی قوموں نے کس قدر ان کی مخالفتیں کیں۔ درآن حالیکہ وہ ان کی معجزات کی

ناظر و شاہد تھیں۔

"ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمته انک انت الوھاب"

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کہتے ہیں ک اب میں خلیفہ دوم کے سلسلے میں شیعہ موقف کو سمجھ سکتا ہوں کہ کیونکر وہ ان کو مسلمانوں کی بد بختی کا سب سے زیادہ ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ جو اس واقعہ قرطاس و قلم کے بعد شروع ہوئی اور امت کو اس ہدایت سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھنا چاہتے تھے محروم کر دیا اور برملا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے سچ تو یہ ہے کہ عقلمند وہ ہے جو حق کو پہچانے قبل اس کے کہ وہ افراد کو پہچانے' اور حق کے مقابلے میں ان کی خاطر عذر تلاش کرے۔ رہے وہ لوگ جو افراد کے ذریعے حق کو پہچانتے ہیں تو ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا کہ ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب اور اس کا سیاسی سپاہ کی یہ عادت ہے کہ وہ شیعان حیدر کرار ؑ کو بالعموم اور ان میں سے متاخرین کو بالخصوص بڑے قبیح الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں ہم ان کی گالیوں کا جواب گالی سے نہیں دیں گے اور نہ ہی ہمیں سروکار رکھیں گے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد علیہم السلام کی سیرت اس

بات کی اجازت دیتی ہے ورنہ محمد بن عبدالوہاب کے اس پرستار کو اس انداز سے جواب دیا جاتا کہ اس کی نسلیں بھی یاد رکھتیں کہ کسی کو ناجائز طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ وہابیوں کے مطاعن قدر زیادہ ہیں کہ ان سب کا یہاں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں۔ سپاہ صحابہ سے تعلق رکھنے والے مولوی صاحبان! تلخ نوائیاں بہت ہو چکی ہیں اب مہرو محبت کی شیرینی کی ضرورت ہے۔ معمولی مسائل کو مدار کفر بنا کر مسلمانوں کو کافر نہ بناؤ بلکہ اگر ہو سکتا ہے تو کافروں کو مسلمان بناؤ اور متحد ہو کر اسلام پر ہونے والی یلغار کفرو الحاد کا مقابلہ فرماؤ۔

اصحاب اور لشکر اسامہ

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی اس داستان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے دو روز قبل ایک لشکر رومیوں سے لڑنے کے لیے تیار کیا اور اس کی کمان اسامہ بن زید کے سپرد کی۔ جن کی عمر اس وقت صرف اٹھارہ سال تھی۔ آپؐ نے اس لشکر میں جن مہاجرین و انصار کو شامل کیا ان میں ابوبکر، عمر، ابو عبیدہ اور دیگر مشہور اصحاب شامل تھے۔

مختصر یہ کہ ان اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فیصلے پر ایسی سخت باتیں کہیں کہ آپؐ کو شدید غصہ آگیا، اور باوجود یہ کہ آپؐ بخار سے بے حال تھے۔ آپ کے سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دو آدمیوں کا سہارا لے کر حجرے سے باہر تشریف لائے۔ درآن حالیکہ آپ کے قدم مبارک لڑکھڑا رہے تھے اور زمین پر خط بنا رہے تھے۔ میرے ماں باپ حضور پر قربان۔ آپؐ منبر پر تشریف لے گئے اور پروردگار کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! یہ کیا باتیں ہیں جو میں اسامہ کو سرداری دینے پر تم میں سے بعض کی طرف سے سن رہا ہوں۔ آج تم اس کی سرداری پر اعتراض کرتے ہو اور کل تم اس کے باپ کی سرداری پر تنقید کرتے تھے۔ خدا کی قسم! وہ سرداری اور سپہ سالاری کے لائق تھا اور اس کا بیٹا بھی اس کی لیاقت رکھتا ہے۔"

(طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹۰)

(تاریخ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۱۷)

(سیرت حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۲۰۷)

پھر آپؐ انہیں اس کام کے لیے جلدی کرنے کا شوق دلاتے رہے کبھی فرماتے تھے:

(جھرو جیش اسامہ" "اسامہ کا لشکر تیار کرلو"

کبھی فرماتے (انفذوا جیش اسامہ) "اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو"

کبھی فرماتے (ارسلوا بعث اسامہ) "اسامہ کے ساتھ لوگوں کو جلدی بھیجو"

آپ ان جملوں کو بار بار دہراتے رہے، لیکن آپ کی بات کو چندان اہمیت نہیں دی گئی۔ اور خلاصہ یہ کہ لوگوں نے مدینہ کے نزدیک "جرف"

کے علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ گویا وہ یہ کام کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

محقق ڈاکٹر تیجانی بیان کرتے ہیں کہ اس جیسی داستان مجھے اس سوال پر مجبور کرتی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے مقابلے میں یہ کیسی جسارت ہے! یہ حق کی کیسی پامالی اور رسول اکرمؐ کی کیسی نافرمانی ہے؟ اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی جو مومنین پر مہربان اور ان کی بھلائی کے خواہش مند ہیں۔ میں کبھی یقین نہیں کرتا اور نہ کوئی دوسرا یقین کرے گا کہ ایسی جسارت کے لیے کوئی عذر تراشا جاسکتا ہے۔

محقق تیجانی مزید بیان کرتے ہیں کہ میں ہمیشہ کی طرح جب بھی ایسے واقعات کا مطالعہ کرتا ہوں جن سے عظمت صحابہ مجروح ہوتی ہو تو کوشش کرتا ہوں کہ نفس واقعہ کی تکذیب کروں یا ایسے واقعہ سے تجاھل کے ساتھ گزر جاؤں لیکن اس واقعہ کی تکذیب کی جاسکتی ہے نہ اس سے تجاہل کیساتھ گزرا جاسکتا ہے۔ جس پر شیعہ سنی اور تمام مورخین کا اتفاق ہے۔ اور میں بھی کہ اپنے پروردگار سے عہد باندھ چکا ہوں کہ انصاف سے کام لوں گا اور مذہب کے معاملے میں کسی تعصب سے کام نہیں لوں گا اور سچ کے سوا کسی بات کے وزن کا قائل نہیں ہوں گا اور سچ بھی جیسا کہ کہتے ہیں اس جگہ کڑوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"قال الحق ولو کان نفسک و قل الحق ولو کان مرا"

"سچی بات کہو چاہے تمہارے اپنے خلاف ہو اور سچی بات کہو چاہیے کڑوی لگے۔"

اور سچ اس واقعے میں یہ ہے کہ کہ جن اصحاب نے اسامہ کی سرداری پر اعتراض کیا تھا در حقیقت انہوں نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی تھی۔ وہ نص صریح کی مخالفت کر رہے تھے جس کے لیے تاویلیں گھڑنا کسی طور مناسب نہیں۔

کوئی عذر پیش بھی نہیں کرسکتے سوائے اس عذر لنگ کے جو وہ تحفظ ناموس صحابہ کے بہانے تراشتے ہیں۔ کوئی آزاد اور عقلمند آدمی کسی وجہ سے ایسے فریب انگیز بہانے قبول نہیں کرے گا مگر یہ کہ ان پڑھ اور نادان افراد میں سے ہو' اور اندھے تعصب کی پٹی اس کی آنکھوں پر باندھی ہوئی ہو۔ایسے لوگ اس فرض کو جس کی اطاعت واجب ہے اور اسی نہج کو جس کا ترک کرنا لازم ہے۔ جان کر بھی دونوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

محقق تیجانی کہتے ہیں کہ میں نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ ان بزرگوں کے لیے کچھ عذر ڈھونڈوں لیکن میرے دماغ میں کوئی بات نہیں آئی بعض مکاتب فکر نے ان کے بارے میں جو عذر تراشے ہیں ان کو پڑھا۔ مثلاً یہ کہ وہ قریش کے بڑے بوڑھوں میں سے تھے اور اسلام لانے والوں میں پیش مقدم تھے جبکہ اسامہ ان ہی سابقون الاولون میں سے تھے اور نہ ہی

انہوں نے بدر واحد اور حنین جیسی تاریخ ساز اسلامی جنگوں میں شرکت کی تھی اور در حقیقت انہیں جنگ کا کوئی تجربہ تھا ہی نہیں' بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس وقت انہیں فوج کی سربراہی کا حکم دیا' وہ اس وقت جوان تھا اور فطری بات ہے کہ آدمی جب سن وسال کے اعتبار سے بڑا ہو جاتا ہے' تو نوجوانوں کے حکم پر سر جھکانے ان کی اطاعت کرنے سے کنی کترانے لگتا ہے۔ لہٰذا لوگوں نے اسامہ کی سربراہی پر اعتراض کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسامہ کی جگہ بزرگ اصحاب میں سے کسی کو مقرر کیا جائے۔

یہ عذر کسی عقلی یا شرعی دلیل کے تحت نہیں ہے اور جس مسلمان نے قرآن کو پڑھا اور اس کے احکام کو سمجھا ہے وہ ایسے عذر کو مسترد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رکھتا کیونکہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے=

"وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں جو کچھ حکم دیں اس کو قبول کر لو اور جس بات سے تمہیں منع کریں اس کو چھوڑ دو۔" (سورۂ حشر آیت: ۷)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے۔

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلاَ مُؤْمِنَةً اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً مُّبِيْنًا"

"کسی مومن مرد یا عورت کو کسی کام میں اختیار نہیں ہے جس کا اللہ اور رسول ﷺ حکم دیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے بے شک وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا ہے۔ (سورۂ احزاب آیت ۳۶)

پس ان واضح عبارتوں کو پڑھنے کے بعد وہ کون سا حیلہ بہانہ رہ جاتا ہے جس کو اہل قلم و فہم قبول کریں اور مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اس گروہ کے بارے میں جس نے رسول اللہ ﷺ کو غصہ دلایا کچھ کہوں؟ حالانکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ اللہ کا غصہ رسول اللہ ﷺ کے غصے میں مضمر ہے۔ لیکن ان کی جسارت دیکھئے کہ ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے آپ ؐ کے حضور میں شور و غل مچایا اور آپس میں اختلاف کیا حالانکہ آپ ؐ بیمار تھے۔ یہاں تک کہ آپ ؐ نے ان لوگوں کو اپنے حجرے سے باہر نکال دیا۔ بتائیے کیا یہ سب باتیں کچھ کم ہیں۔ ان باتوں کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ نادم ہو کر جادۂ ہدایت کی طرف پلٹتے۔ بارگاہ احدیت میں توبہ کرتے۔ مغفرت طلب کرتے اور جیسا کہ قرآن نے انہیں سکھایا تھا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے لیے بخشش کی دعا کراتے' وہ دو قدم اور آگے بڑھ گئے' اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (جو رؤف و رحیم تھے) گستاخی کی۔ ان کے حق کا پاس نہ کیا اور ان کے لیے کسی ادب و احترام کے قائل نہ ہوئے۔ پس

واقعہ قرطاس و قلم کے ٹھیک دو دن بعد کہ ابھی یہ زخم مندمل بھی نہ ہوا تھا۔ اسامہ کی سالاری پر اعتراض جڑ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس حالت پر مجبور کیا جس کا ذکر مورخین نے کیا ہے یعنی اس حالت میں کہ شدت مرض کے سبب آپؐ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹ رہے تھے آپؐ حجرے سے نکلے اور بر سر ممبر قسم کھا کر لوگوں کو یقین دلایا کہ "اسامہ لشکر کی سالاری کی اہلیت رکھتے ہیں"

اور خود پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ لوگ وہی تھے جنہوں نے اس سے پہلے زید بن حارثہ کی سربراہی پر بھی اعتراض کیا تھا۔ یہ بات ہمیں سمجھاتی ہے کہ ان لوگوں نے ماضی میں بھی یہی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور یہ لوگ ہرگز ایسے نہیں کہ اگر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں کوئی حکم دیں تو یہ اسے تسلیم کر لیں اور ان کے دل میں کوئی کراہت نہ ہو۔ بلکہ یہ لوگ مخالفت اور محاذ آرائی کرنے والوں میں سے تھے جو تنقید کو اپنا حق جانتے تھے خواہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف کیوں نہ ہو۔

اور ان کی سرکشی کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غصے کا مشاہدہ کر لینے کے بعد، جن کے ہاتھ سے اسامہ کا پرچم عطا ہوا تھا انہوں نے سستی و کاہلی سے کام لیا اور آپؐ نے ان لوگوں کو لشکر اسامہ سے فورا جا ملنے کا حکم دیا تھا مگر وہ نہ ملے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ

آپ ؐ پر قربان ہوں' دنیا سے رحلت کر گئے اور امت کی نافرمانی کا داغ دل میں لے کر گئے۔ آپ کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ میری امت رجعت قہریٰ سے دو چار ہو جائے گی اور جہنم کا ایندھن بن جائے گی سوائے تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے نجات پائی ہے' اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان اونٹوں سے تشبیہ دی ہے جو چراگاہ میں رہ گئے۔ (یہ تشبیہ افراد کی کمی کی وجہ سے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے راستے پر ثابت قدم رہے ان اونٹوں کی طرح جو چراگاہ میں رہ جائیں جن کی تعداد بہ نسبت دوسروں کے کم ہوتی ہے۔)

اور اگر ہم زیادہ غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفہ ثانی اس سارے قصے کا مرکزی کردار ہیں۔ کیونکہ وہی تھے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلیفہ ابوبکر کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اسامہ کو معزول کریں اور ان کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر کریں اور ابوبکر نے ان سے کہا۔ تیری ماں تجھ کو روئے' اے خطاب کے بیٹے! کیا تو مجھے حکم دیتا ہے کہ میں سے معزول کروں جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر کیا ہے۔ (الطبقات الکبری ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹۰) تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۶۲۶)

پس عمر اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھے جس کو ابوبکر نے سمجھایا اس میں کوئی اور راز ہے جو تاریخ نویسوں سے پوشیدہ رہ گیا ہے یا پھر یہ کہ انہوں

نے خود پوشیدہ رکھا جیسا کہ ان کی عادت ہے تاکہ عمر کی آبرو برباد نہ ہو۔ اور اسی لیے انہوں نے "ہجر" (ہذیان بکتے ہی۔) کو غلبتہ الوجع (تکلیف نے ان پر غلبہ کرلیا ہے) سے بدل لیا۔

محقق ڈاکٹر تیجانی مزید کہتے ہیں کہ مجھے ان اصحاب پر تعجب ہوتا ہے جنہوں نے جمعرات کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غصہ دلایا اور ان پر ہذیان گوئی کی تہمت لگائی اور یہ کہہ دیا کہ "ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے جب کہ اللہ کی کتاب ان سے کہتی ہے۔

(قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ)

"اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ تم سے محبت کرے۔" (سورہ آل عمران آیت: ۳۱)

تو گویا وہ لوگ اللہ کی کتاب اور اس کے احکام کو زیادہ جانتے تھے چنانچہ ان کو جن پر کتاب نازل ہوئی تھی اس واقعہ کو ٹھیک دو روز بعد اور آپ ؐ کی رحلت کے دو روز پہلے زیادہ سے زیادہ غصہ دلاتے ہیں اور آپ ؐ اسامہ کو پرچمدار لشکر بناتے ہیں تو اس پر اعتراض کرتے ہیں اور آپ ؐ کے فرمان کی اطاعت نہیں کرتے اگرچہ آپ ؐ نے اس پہلی مصیبت میں بیمار ہو کر بستر پکڑ لیا تھا تو اس دوسری مصیبت میں اس بات پر مجبور ہوئے کہ سر پر پٹی

باندھے ہوئے اور چادر اوڑھے ہوئے اس حالت میں کہ دو آدمی آپ ؐ کو سہارا دیئے ہوئے تھے' اور درد کی شدت سے آپ پاؤں گھسیٹتے ہوئے اپنے حجرے سے نکلے' اور منبر پر جا کر ایک تفصیلی خطبہ دیا جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد انہیں سمجھایا کہ ہذیان گوئی آپ سے دور ہے نیز انہیں بتلایا کہ آپ ؐ کو ان لوگوں کے اعتراض کی خبر ملی ہے اور پھر انہیں ایک واقعہ بھی یاد دلائیں کہ چار سال قبل بھی لوگوں نے آپ ؐ کے حکم کو مذاق کے طور پر لیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی لوگوں کو اس بات کا یقین ہے آپ ہذیان بکتے ہیں؟ یا شدت درد سے یہ نہیں جانتے کہ آپ ؐ کیا کہہ رہے ہیں؟

اے پاک پروردگار! کیسی مجال رکھتے ہیں یہ لوگ کہ تیرے رسول اللہ ﷺ کو قابل مواخذہ قرار دیتے ہیں؟ اور جس معاہدہ صلح پر تیرا رسول ﷺ دستخط کرتا ہے اس کی مخالفت کرتے ہیں اور شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ ؐ حکم دیتے ہیں کہ قربانی کرو اور سر منڈاؤ لیکن آنحضرت ﷺ کے اس حکم کو ان میں سے ایک شخص بھی نہیں مانتا اور دوسری بار رسول اللہ ﷺ کا کرتا پکڑ کر کھینچتے ہیں اور اسے عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھانے سے روکتے ہیں' اور آنحضرت ﷺ سے کہتے ہیں کہ خدا نے آپ کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے گویا جو کچھ تو نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا ہے یہ لوگ اسے اس کی تعلیم دیتے ہیں جب کہ

اے رب جلیل! تو نے قرآن میں فرمایا ہے۔

(وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ النَّاسَ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ" (سورہ نحل آیت ۴۴)

"اور قرآن کو ہم نے تم پر نازل کیا تاکہ جو احکام لوگوں کے لیے اتارے ہیں تم انہیں صاف صاف بیان کر دو۔"

اور اے اللہ! اسی طرح تو فرماتا ہے:

(اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَّ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ) (سورۂ النساء آیت ۱۰۵)

"بے شک ہم نے تم پر قرآن نازل کیا' حق کے ساتھ تاکہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس کی اللہ نے تمہیں تعلیم دی ہے۔"

اور اے پاک پروردگار! اسی طرح تو فرماتا ہے اور تیرا قول ہے:

(كَمَا اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلاً مِنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیَاتِنَا وَ یُذَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمْ مَالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ)

"جیسا کہ ہم نے اپنی طرف سے ایک رسولؐ تمہارے پاس بھیجا جو ہماری آیتیں تمہیں سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں قرآن

اور دانائی کی باتیں سکھاتا ہے اور تمہیں وہ کچھ تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے" (سورہ بقرہ آیت ۱۵۱)

معروف محقق ڈاکٹر تیجانی سماوی اپنی کتاب تجلی میں لکھتے ہیں کہ اللہ کی شان کہ کچھ لوگ خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بلند تصور کرتے تھے اور آپؐ کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں کبھی آپؐ پر ہذیان گوئی کی تہمت لگاتے ہیں، آپؐ کے حضور میں داتن کلکل کا مظاہرہ کرتے ہیں آپؐ کے مقام و مرتبہ کو پہچاننے کی بجائے سوئے ادب سے کام لیتے ہیں اور کبھی زید بن حارثہ کو امیر لشکر بنانے اور بعد ازاں ان کے صاحبزادے اسامہ بن زید کو پرچم عطا کرنے پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

ان تمام حقائق کو جان لینے کے بعد اہل فکر و تحقیق کے لیے اس سے انکار کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ شیعہ برحق ہیں؟ جب وہ بعض اصحابؓ کے مقام و مرتبہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور جناب رسولؐ اور اہل بیت کے احترام اور ان سے محبت و مودت کے باعث ان واقعات پر کبیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ محقق تیجانی کہتے ہیں "ہر چند کہ میں نے اختصار کے پیش نظر ایسے چار یا پانچ نمونے نقل کئے ہیں جن میں اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی۔ لیکن علمائے شیعہ نے سینکڑوں مواقع ذکر کئے ہیں جن

میں اصحاب نے نص صریح کی مخالفت کی اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے صرف اور صرف علمائے اہل سنت کی تحریر کردہ صحاح مسانید سے استدلال کیا ہے۔

محقق مذکور مزید لکھتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اصحاب کے طرز عمل کا مطالعہ کرتا ہوں تو میرے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ میری یہ حیرانی و پریشانی نہ صرف اصحاب کے طرز عمل پر ہوتی ہے بلکہ علمائے اہل سنت کے طرز عمل پر بھی ہوتی ہے۔ یہ حضرات ہم سے اصحاب کا تعارف اس طرح کراتے ہیں گویا اصحاب ہمیشہ حق پر رہے اور وہ تنقید سے بالاتر ہیں اس طرح انہوں نے اہل تحقیق کو حقیقت تک رسائی سے روک دیا اور اہل فکر و دانش کو فکری تناقضات میں الجھا دیا۔

محقق تیجانی کہتے ہیں کہ میں نے گزشتہ صفحات میں مشتے از خروارے جو نمونے پیش کئے ہیں ان پر بعض دیگر نمونوں کا اضافہ کرتا ہوں تاکہ "نقوش صحابہ" کسی میک اپ کے بغیر سامنے آسکیں اور ہم شیعوں کے نکتہ نظر کو بھی سمجھ سکیں۔"

بخاری اعمش سے روایت کرتے ہیں' اور اعمش کہتے ہیں کہ مجھ سے شفیق نے بیان کیا اور شفیق کو عبداللہ نے بتایا کہ=

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ چیزیں لوگوں میں تقسیم فرمائیں جیسا کہ

آپ ؐ بعض اوقات کیا کرتے تھے اس موقع پر انصار میں سے ایک نے کہا خدا کی قسم! یہ ایسی تقسیم ہے جس میں رضائے الٰہی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ میں نے کہا' بہرحال میں اس بات کو رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کروں گا۔ پس میں آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ؐ اصحاب کی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے' میں نے اپنی بات عرض کی۔ یہ بات آنحضرت ؐ کے دل پر سخت گراں گزری۔ آپ ؐ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آپ ؐ بہت خشمگین ہوئے' حتی کہ میں آرزو کرنے لگا' اے کاش! میں نے آپ ؐ کو اس بات سے آگاہ نہ کیا ہوتا۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا "موسیٰ ؑ نے اس سے زیادہ اذیت دیکھی اور صبر کیا۔" (صحیح بخاری میں جلد ۴ صفحہ ۴۷ کتاب الادب۔ باب الصبر علی الاذی)

محقق تیجانی اپنی کتاب تجلی میں مزید لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری ایک اور جگہ روایت ہے کہ انس بن مالک نے ہم سے بیان کیا کہ انہوں نے کہا=

"میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ راستہ چل رہا تھا اس وقت حضور ﷺ ایک نجرانی عبا پہنے ہوئے تھے' جس کے کنارے موٹے تھے۔ ایک اعرابی آپ ؐ کے پاس پہنچا اس نے آپ ؐ کی عبا کے کنارے کو پکڑ کر اسے بڑے زور سے کھینچا اور پھر کہا۔ اے محمد! حکم

دیجئے! آپ ؐ کے پاس اللہ کا جو مال ہے اس میں سے کچھ مجھے دیں۔ حضرت نے تبسم سے فرمایا اور حکم دیا کہ اسے کچھ دے دیا جائے۔"

(صحیح بخاری جلد ۴ کتاب الادب۔ باب التبسم والضحک)

مزید برآن بخاری "باب من لم یواجہ الناس بالعتاب" میں نقل کرتے ہیں کہ عائشہ نے کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چیز اپنے دست مبارک سے تیار کی اور آپ ؐ نے لوگوں کو اجازت دی کہ وہ اس چیز سے استفادہ کریں ایک گروہ نے اسے استعمال کرنے سے گریز کیا۔ جب آپ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ؐ نے خطبہ پڑھا اور حمد و ثناء الٰہی کے بعد فرمایا:

"کیا بات ہے کہ جو چیز میں نے خود تیار کی' ایک گروہ اس سے دوری اختیار کرتا ہے؟ خدا کی قسم! خدا کے فضل سے میں ان لوگوں سے زیادہ جاننے والا ہوں اور اس کے حضور میں تم سب لوگوں سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔" محقق مذکور مزید لکھتا ہے کہ اب جو بھی اس طرح کی روایات کو نظر غائر دیکھتا ہے' یہی سمجھتا ہے کہ کچھ اصحاب خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام و موقف سے بالا تر تصور کرتے تھے اور اپنے تئیں سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطا کر سکتے ہیں' جب کہ ان سے خطا نہیں ہوتی۔ ان کی ایسی ہی باتوں نے بعض مورخین کو

اس پر مجبور کیا ہے کہ اصحاب کے تقدس کو بچانے کے لیے بند باندھیں اور ان کے لیے تاویلیں گھڑیں۔ ہر چند کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی ہو۔ نیز انہوں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ بعض اصحاب کو علم و تقویٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فوقیت کا حامل قرار دیں۔

اسی نوع کا ایک واقعہ وہ ہے جو مئورخین نے غزوہ بدر کے اسیروں سے متعلق لکھا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلطی پر تھے۔ اور عمر کی رائے صحیح تھی۔ وہ اس بارے میں جھوٹی روایت نقل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اگر اللہ ہمیں کسی مصیبت میں گرفتار کردے تو سوائے ابن خطاب کے کوئی شخص اس سے نجات نہیں پائے گا۔"

گویا زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔

"اگر عمر نہ ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہلاک ہو جاتے۔"

محقق مذکور کہتا ہے کہ خدا کی پناہ اس فاسد عقیدے سے کہ اس سے زیادہ قبیح عقیدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کی قسم! جو بھی ایسا عقیدہ رکھتا ہے وہ اسلام سے دور ہے۔ اتنا دور جتنا مشرق مغرب سے دور ہے اس پر لازم ہے کہ وہ ہوش کے ناخن لے' اور اپنے دل سے

شیطان کو نکال باہر کرے۔ قرآن میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

(اَفَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰاہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَ قَلْبِہٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشَاوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ)

"بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور وہ جانتے بوجھتے گمراہ ہو رہا ہے تو خدا نے بھی اسے گمراہی میں چھوڑ دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے پس خدا کے سوا کون اس کو راہ پر لا سکتا ہے تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے۔" (سورہ جاثیہ آیت ۲۳)

محقق تیجانی قسم یاد کر کے کہتے ہیں کہ مجھ کو اپنی جان کی قسم! یہ لوگ جو ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں راہ حق سے ہٹ جاتے ہیں۔ اور اموال کی ایسی تقسیم کرتے ہیں جس میں اللہ کی رضا پیش نظر نہیں رہی بلکہ اس تقسیم میں آپؐ کی ذاتی پسند اور دوست داری کو دخل ہے اور یہ جو لوگ ایسی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جن کو رسول اللہ نے اپنے پاک ہاتھوں سے بنایا ہے اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ صاحب علم اور صاحب تقویٰ جانتے ہیں۔ مسلمانوں کی

طرف سے کسی عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ چہ جائیکہ انہیں فرشتوں کے درجے تک لے جائیں اور یہ مانیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بندگان خدا میں سب سے افضل ہیں اور مسلمانوں کو صرف اسی لیے ان کی پیروی کا حکم دیں کہ وہ نبیؐ کے اصحاب ہیں۔

اور مسلمانوں کے بعض مکاتب فکر کی روش کا تضاد ہے کہ جب وہ محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجتے ہیں تو سارے اصحاب کو اس میں شامل کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیت رسولؐ کی قدر و منزلت کو قرآن کریم میں متعین کر دیا ہے' اور لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے میلان باطنی کے علی الرغم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت رسولؐ پر صلوات اور تحیات و برکات بھیجیں تاکہ وہ اہل بیتؑ کے برابر میں خاضع و متواضح رہیں' اور ان کے بلند رتبہ کو جانیں۔ تو ہم یہ کیوں چاہتے ہیں کہ اصحاب کو ان کے اپنے درجے سے بڑھائیں اور ان حضرات کی مانند قرار دیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام لوگوں پر برتری بخشی ہے۔

محقق تیجانی مزید لکھتے ہیں کہ آپ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے دیں کہ امویوں اور عباسیوں نے۔ (جی ہاں ان ہی لوگوں نے کہ جنہوں نے اہل بیت الرسولؐ کے ساتھ دشمنی کی) ان کو جلا وطن کیا' ان کے

ماننے اور چاہنے والوں کا قتل عام کیا۔ یہ سمجھ لیا تاکہ اہل بیتؑ کے لیے کس قدر فضیلت وارد ہے؟۔ اور ان کے دشمنوں کے لیے کس قدر خطرات موجود ہیں؟۔ اس لیے کہ جہاں خدائے کریم کسی مسلمان کی نماز ان پر درود بھیجے بغیر قبول نہیں کرتا۔۔۔۔ وہاں وہ اہل بیتؑ سے اپنی دشمنی اور کجی کی تاویل کس طرح کرسکتے ہیں؟ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے درود میں اصحاب کو اہل بیتؑ سے جوڑ دیا تاکہ لوگوں کو اس طرح دھوکہ دے سکیں اور سادہ لوح لوگ یہ سمجھیں کہ اصحاب اور اہل بیتؑ فضیلت میں ایک ہی درجے پر فائز ہیں۔

محقق مذکور مزید لکھتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کے چند بزرگ، اصحاب رہے ہیں کہ جنہوں نے بعض سادہ لوحوں کو (جو ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں رہے تھے) یا بعض تابعین کو اپنا زر خرید بنالیا، اور ان سے یہ چاہا کہ وہ شان صحابہ میں خاص کر ان اصحاب کی شان میں جو خلافت پر فائز ہوئے، اور وہ امویوں اور عباسیوں کے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہونے کے براہ راست سبب بنے۔ حدیثیں گھڑیں۔ تاریخ ہمارے دعوے پر بہترین گواہ ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی اور چھان پھٹک کیجئے تو یہ دیکھ کر آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گئیں کہ=

عمر بن خطاب جو اپنے گورنروں کے احتساب کے لیے مشہور تھے اور معمولی سی غلطی پر ان کو معزول کر دیتے تھے۔ معاویہ بن سفیان کے معاملے میں اتنے نرم ہیں کہ اس سے ہرگز باز پرس نہیں کرتے۔ ابوبکر نے ان کو اپنا گورنر مقرر کیا تھا اور عمر نے بھی اپنی خلافت میں ان کے اس عہدے کی توثیق کی' اور بہت سی شکایت کرنے والوں کے علی الرغم انہوں نے ایک بار بھی معاویہ کی سرزنش نہیں کی۔ اور جب لوگوں نے یہ شکایت کی کہ معاویہ ریشمی لباس پہنتا ہے جب کہ "رسول اللہ ﷺ نے سونے کی انگوٹھی اور ریشمی لباس کو مردوں پر حرام قرار دیا ہے" تو انہوں نے جواب دیا۔ "ان کو چھوڑو وہ عربوں کے کسریٰ ہیں۔"

اس طرح معاویہ بیس سال سے زیادہ گورنری کرتا رہا اور کسی ایک فرد نے بھی اس پر تنقید نہیں کی' اور نہ کسی نے اس کو معزول کیا۔ اور جب خلافت عثمان بن عفان کو ملی تو انہوں نے دیگر ریاستیں بھی اس کے اختیار میں دے دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملت اسلامی کی دولت پر قابض ہوگیا۔ اور اس کی حکومت مستحکم ہو گئی پس اس نے اپنی عسکری قوت میں اضافہ کیا اور عرب کے اوباشوں کو اپنے گرد جمع کیا تاکہ خلیفہ رسولؐ کے خلاف بغاوت کرکے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو جائے اور ڈنڈے کے زور پر حکومت کرے اور اپنی موت سے پہلے اپنے فاسق اور شرابی بیٹے یزید کے لیے تلوار کے سائے میں

بیعت لے۔ اور اس بیعت کا قصہ طویل ہے کہ جس کو اس کتاب میں بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم ان اصحاب کی فکری اپج کو سمجھ سکیں۔ جو کرسی خلافت پر بیٹھ کر انہوں نے کس طرح' براہ راست' امویوں کی حکومت کے قیام کے لیے میدان ہموار کیا اور قریش کی اس خواہش کو پورا کرنے میں لگ گئے کہ نبوت اور خلافت دونوں بنی ہاشم میں نہیں ہونی چاہیے (مزید توضیح کے لیے مولانا ابو الاعلی مودودی کی کتاب" خلافت و ملوکیت" اور احمد امین کی کتاب "یوم الاسلام" ملاحظہ کیجئے)

پس بجا ہے بلکہ واجب ہے کہ امویوں کی حکومت ان لوگوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے ان کے لیے میدان ہموار کیا اور کم سے کم شکریہ یہ تھا کہ وہ بے ضمیر راویوں کے ذریعے ان کے بزرگوں کی فضیلت میں روایتیں گھڑیں' تاکہ وہ لوگ ان کے مخالف (اہل بیتؑ) کے مقابلے میں افضل و اکمل دکھائی دیں اور ان کے لیے جو روایت سازی کی گئی ہے' خدا گواہ ہے کہ اگر شرعی' عقلی اور منطقی دلائل کی روشنی میں انہیں پرکھیں تو اس میں سے کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ جاتی جو قابل ذکر ہو' مگر یہ کہ ہماری عقل چرنے گئی ہو' اور ہم تناقضات پر ایمان لائیں۔

محقق تیجانی کہتے ہیں کہ میں محض نمونے کے طور پر ذکر کرتا

ہوں کہ ہم عدل فاروقی کے چرچے بہت سنتے ہیں اور ان کی عدالت کے بارے میں یہ باتیں زبان زد عام ہیں کہ۔

"اے عمر! تم عدل کرتے کرتے سو گئے"

اور یہ کہ:

"لوگوں نے عمر کو کھڑا کر کے دفن کیا تاکہ ان کے ساتھ عدل مرنہ جائے۔"

آپ ان کی عدالت کے بارے میں جو چاہیں کہیں لیکن صحیح تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ=

"عمر نے جب ۲۰ھ میں بیت المال سے عطا کا حکم دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر ہرگز عمل نہیں کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب مسلمانوں کو بیت المال کے اموال میں برابر حق دار جانتے تھے۔ اور کسی کو دوسرے پر مقدم نہیں رکھتے تھے۔ اور ابوبکر بھی اپنے عہد خلافت میں اسی سنت پر قائم رہے۔ لیکن عمر نے دوسری ہی روش ایجاد کی اور اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں کو دوسروں پر مقدم جانا۔ اسی طرح قریش کے مہاجرین کو دوسرے مہاجرین پر اور اصلا مہاجرین کو بطور کلی انصار پر مقدم جانا اور عرب کو عجم پر اور آقاؤں کو غلاموں پر ترجیح دی (شرح ابن ابی الحدید جلد ۸ صفحہ ۱۱)

اور قبیلہ مضر کو قبیلہ ربیعہ پر برتر جانا چنانچہ مضر کے لیے

۳۰۰ درہم اور ربیعہ کے لیے ۲۰۰ درہم مقرر کیا (تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۰۶) اور قبیلہ اوس کو خزرج پر ترجیح دی (فتوح البلدان صفحہ ۴۳۷)

پس اے اہل دانش! مجھے بتاؤ کہ اس تفریق میں عدل و عدالت کہاں ہے؟ محقق تیجانی اپنی کتاب تجلی میں مزید لکھتے ہیں کہ عمر کے علم و دانش کے بارے میں بھی ہم کچھ زیادہ ہی باتیں سنتے ہیں' یہاں تک کہا گیا ہے کہ:

"وہ اصحاب میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں"

اور کہا گیا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عمر میں اختلاف کی صورت میں آیات الٰہی عمر کی موافقت میں نازل ہوئی تھی۔"

لیکن صحیح تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ عمر کی رائے نزول قرآن کے بعد بھی قرآن سے موافقت نہیں رکھتی تھی۔

"عمر کے دروہ خلافت میں اصحاب میں سے ایک ان سے پوچھتے ہیں۔"

اے امیر المومنین! میں مجنب ہو گیا ہوں اور مجھے غسل کے لیے پانی نہیں ملا کیا کروں؟ عمر جواب دیتے ہیں۔ نماز نہ پڑھو! عمار بن یاسر انہیں تیمم یاد دلانے پر مجبور ہوتے ہیں' لیکن عمر مطمئن نہیں

ہوتے اور عمار سے کہتے ہیں ہم تم پر اسی قدر بوجھ دلاتے ہیں جس قدر تم میں طاقت ہے۔ "انا نحملک و تحملت" صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۲)

محقق تیجانی پوچھتے ہیں کہ اب آپ ہی بتائیے کہ عمر بھلا آیہ تیمم سے جو کتاب اللہ میں وارد تھی، کہاں واقف تھے اور عمر کا علم سنت رسولؐ کے بارے میں کیا ہوا؟ جنہوں نے وضو کے ساتھ ساتھ تیمم کا طریقہ بھی لوگوں کو سکھایا تھا؟۔

اور عمر خود بہت سے مواقع پر اقرار کرتے ہیں کہ وہ عالم اور دانشمند نہیں ہیں بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"سب لوگ عمر سے زیادہ قابل ہیں یہاں تک کہ عورتیں بھی۔"

اور وہ کتنی ہی بار دہراتے ہیں کہ:

"اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

اور ان کی عمر تمام ہو گئی اور وہ دنیا سے چلے گئے مگر "کلالہ" کا حکم نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں ہر مرتبہ ایک نیا حکم دیتے تھے جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے (کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے بظاہر کلالہ کے معنی ماں باپ اور اولاد کے علاوہ وارث کے ہیں)

محقق مذکور مزید پوچھتے ہیں تو پھر بتاؤ اے عقل مند اور دانش

مند! وہ علم کیا ہوا؟ اسی طرح تیجانی صاحب کہتے ہیں کہ ہم عمر کی شجاعت کے بارے میں بہت کچھ سنتے ہیں۔ اس بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ=

"عمر جب اسلام لائے تو قریش کو سخت وحشت ہوئی اور عمر کے اسلام لانے سے مسلمان طاقت ور ہو گئے۔"

اور کہا گیا: "اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب کے وسیلے سے اسلام کو عزت و شوکت دی۔"

اور کہا گیا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت اسلام کو ظاہر نہیں کیا مگر عمر کے اسلام لانے کے بعد۔"

لیکن محقق تیجانی لکھتے ہیں کہ صحیح تاریخ نے ہمارے لیے عمر کی شجاعت کے بارے میں کچھ بھی نقل نہیں کیا ہے۔ تاریخ نے ہرگز ایسی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے کہ عمر نے کسی مشہور یا معمولی آدمی کو جنگ بدر یا جنگ احد یا جنگ خندق وغیرہ میں کسی کو قتل کیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس واقعات ہوئے ہیں۔ تاریخ ہمیں خبر دیتی ہے کہ وہ جنگ احد میں دیگر بھاگنے والوں کے ساتھ بھاگ گئے۔ اس طرح جنگ حنین میں بھاگے اور فتح خیبر کے لیے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں بھیجا گیا لیکن وہ بے نیل و مرام لوٹے۔ یہاں تک کہ وہ جب تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں بھی شرکت کرتے تو ہمیشہ پچھلی صفوں میں ہوتے تھے اور کبھی امیر لشکر

نہیں ہوئے تھے اور ان لشکروں میں آخری لشکر اسامہ کا تھا جس میں وہ اسامہ بن زید نام کے ایک نوجوان سپہ سالار کے ماتحت سپاہی تھے۔

محقق مذکور خرد مندوں سے پوچھتے ہیں کہ تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اور ہم عمر بن خطاب کے تقوی اور خدا ترسی اور گریہ و مناجات کے بارے میں بہت سنتے ہیں' یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ

=

"انہیں خوف خدا اس درجہ تھا کہ اگر عراق میں کوئی خچر بھی پھسل جاتا تھا تو انہیں خوف لاحق ہوتا تھا کہ خدا اس بناء پر ان کا مؤاخذہ کرے گا کہ انہوں نے راستہ صاف نہیں کیا تھا۔"

لیکن صحیح تاریخ ہمیں خبر دیتی ہے کہ وہ سخت گیر تھے اور ہرگز کوئی خوف خدا نہیں رکھتے تھے اور اگر کوئی شخص ان سے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں سوال کرتا تو اسے کسی خطا و قصور کے بغیر اس قدر مارتے تھے کہ اس کا بدن لہولہان ہو جاتا تھا۔ اگر لوگ صحیح کہتے ہیں تو وہ اس وقت کیوں خدا سے نہیں ڈرے۔ جب انہوں نے تلوار کھینچ لی' اور ہر اس شخص کو جو یہ کہے کہ "محمد مر گئے" دھمکی دی' اور انہوں نے خدا کی قسم کھائی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے نہیں گئے' بلکہ حضرت موسیٰ ؑ کی طرح اپنے خدا سے مناجات کرنے گئے

ہیں۔'' پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر کسی نے محمدؐ کی موت کے بارے میں لب کشائی کی تو وہ اس کی گردن مار دیں گے۔ (تاریخ طبری و تاریخ ابن کثیر)

اور اس وقت کیوں خدا سے نہیں ڈرے جس وقت یہ دھمکی دی کہ جو لوگ فاطمہ زہراءؑ کے گھر میں ہیں' اگر وہ بیعت کے لیے نہ نکلے تو گھر کو جلا دیں گے۔ (الامامتہ والسیاستہ ابن قتیبہ دینوری) اور ان سے کہا گیا ''فاطمہ بھی گھر میں موجود ہیں؟'' تو انہوں نے کہا۔ ''ہوا کریں''

اس طرح انہوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جسارت کی اور اپنی خلافت کے زمانے میں وہ فیصلے کئے اور ایسے احکام جاری کئے جو قرآن کریم کے تمام متون اور سنت نبوی کے خلاف تھے (کتاب النص والاجتہاد مئولفہ سید عبد الحسین شرف الدین کا مطالعہ کیجئے جس میں بہت سے مواقع کا ذکر کیا گیا اور بتا تا گیا ہے کہ عمر نے نص کے مقابلے میں اجتہاد کیا ہے اس سلسلہ میں ان ماخذ کا ذکر موجود ہے جو تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک قابل قبول نہیں)

اے کاش علمائے اہل سنت والجماعت ان روشن و آشکار مضامین کو جو اصحاب کے مقام و مرتبہ کو زیر بحث لاتے ہیں' نقل نہ کرتے اور ہمیں شک و تردد اور بد گمانی میں مبتلا نہ کرتے۔

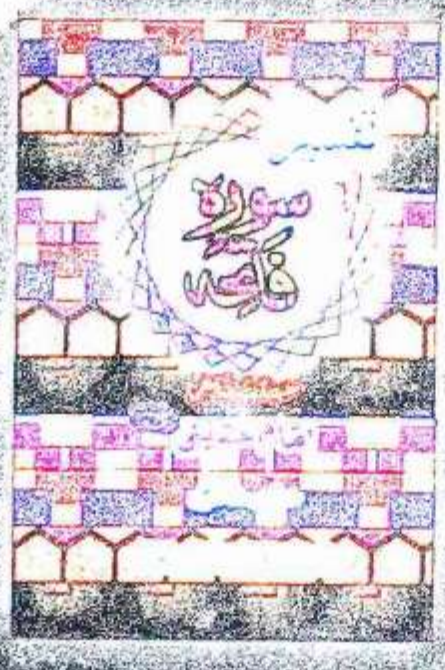

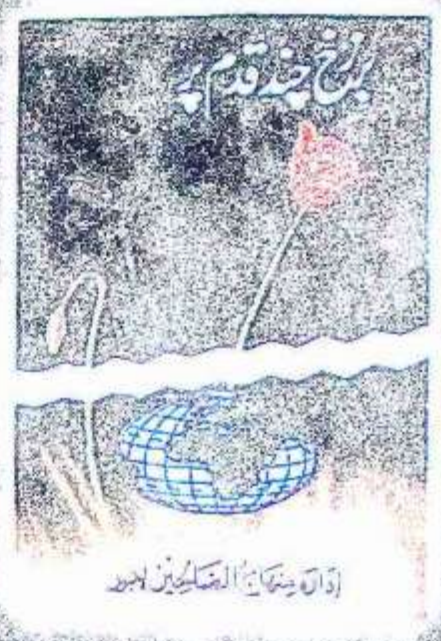

ادارہ منہاج الصالحین لاہور